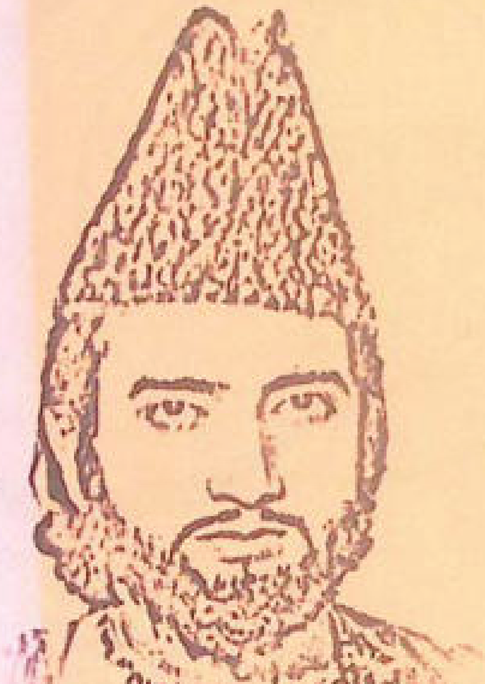
فیضانِ غالب

جمیل مظہری



ترتیب و تعارف محمد رضا کاظمی

الفاظ فاؤنڈیشن، کراچی

فیضانِ غالب

فیضانِ غالب

جمیل مظہری

ترتیب و تعارف
محمد رضا کاظمی

الفاظ فاؤنڈیشن، کراچی

پہلا ایڈیشن

۲۰۱۴ء

جملہ حقوق : بہ حق مصنف محفوظ ہیں

کمپوزنگ : احمد گرافکس

قیمت : ۱۵۰ روپے......10/امریکی ڈالر

پرنٹر : اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

Alfaz Foundation Karachi

B-116/A Amroha Society Sector 37-A, Scheme 33,

Gulzar-I-Hijri Karachi-75290

E.Mail: Alfazfoundaion.dhn@gmail.com

Phone: 021-34430588 Cell: 0346-2731947

ترتیب

رواق منظر چشم من آشیانهٔ تست
کرم نما و فرود آ که خانه خانهٔ تست
نشاط معنویان از شراب خانهٔ تست
فسون بابلیان فصلی از فسانهٔ تست
حذر ز پرسش رنگین دلبرانهٔ تست
که خون حسرت ما سرخی فسانهٔ تست

تعارف

گفتمش چوں بود عظیم آباد
گفت رنگیں ترا از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نباشد از سوہن

غالب جادۂ بیدل کے شیدائی تھے۔ یہ اشعار ان کی غائبانہ عقیدت کا اظہار ہو گئے۔ عظیم آباد بیدل کا مولد نہ سہی مسکن تو تھا اور اسی نسبت سے غالب کو عزیز ہوگا۔ عظیم آباد کو بھی غالب سے غائبانہ تعلق رہا بھی معاندانہ بھی والہانہ۔ یہ دونوں رویّے کم بیش ایک ہی دور میں گزرے اور اسی شہر کے ایک ہی محلہ مغل پورہ سے ابھرے۔ مغل پورہ کا غالب سے ایک نسبی تعلق تھا اور یہیں انیسویں صدی کے آخر میں مرزا یاس یگانہ چنگیزی پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کی ابتدا میں علامہ جمیل مظہری۔ کہنے کو یاس بن گئے غالب شکن اور جمیل مظہری کہلائے غالب کے پاسدار فن، لیکن یہ قصہ سادہ نہیں پیچیدہ ہے۔ یاس شاد کے شاگرد بنے جو غالب سے زیادہ آتش کے سحر میں گرفتار تھے۔ جمیل مظہری شاد کے بھیجے جی کلکتے جا کر وحشت کے شاگرد بنے۔ یہ وہی وحشت تھے جنہیں حالی جیسے تلمیذِ غالب نے تقلیدِ غالب کی سند دی تھی۔ یہی نسبت جمیل مظہری کو وحشت تک لائی تھی جیسا کہ انہوں نے خود اظہار کیا ہے:

پیچیدہ رسم و راہِ سخن دیکھ کر جمیل
مدت سے آرزو تھی کوئی راہ بر ملے
وحشت بھی ہیں طریقۂ غالب پہ گامزن
یعنی جنابِ خضر ہمیں ہم سفر ملے

جمیل مظہری کو جو ادبی ماحول ملا تھا، اس میں غالب کی تقلید قدرے نئی بات تھی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یاس کی آتش پرستی شاد کا عطیہ تھی۔ اب جمیل مظہری کا بیان ملاحظہ ہو:

"سولہ سترہ برس کی عمر میں جب مجھے کہیں سے غالب کا دیوان ہاتھ لگ گیا تو میرے ابا جان نے مجھے اس کے مطالعہ سے یہ کہہ کر روکا کہ اس سے تمہارا ذوقِ سخن بگڑ جائے گا اور زبان خراب ہو جائے گی.......... نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے مجھے غالب کا دیوان پڑھوایا اور تمام شعراء کو چھوڑ کر غالب کا دل دادہ بنایا۔ میرے ذوقِ سخن کا سانچہ بنانے میں غالب سے پہلے اقبال کا ہاتھ ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کے ذریعہ میں غالب تک پہنچا[۲]"

مگر جمیل مظہری کی صاحب نظری ان کو اپنے والد کی فہمائش سے آزاد نہ کرا سکی۔ غالب سے ان کی انسیت اور اپنے والد (مولوی خورشید حسنین، صاحب مثنوی جلوۂ حسن) سے بے پناہ محبت ان کے شعور کی رو میں ایک ساتھ داخل ہوگئیں۔ جب تک وہ تخلیقی سفر میں مصروف رہے۔ جب تک وہ فکری مسائل سے نبرد آزما رہے۔ غالب کا دھارا سطح پر رہا لیکن جیسے ہی وہ عملی تنقید کے قریب آئے ان کے والد کی فہمائش ابھر آئی اور آخرش جب جمیل مظہری نے اپنے شعری سرمائے کا محاسبہ کیا تو انہیں شبہ ہوا کہ غالب کی وہ خو جو آغا جان عیش کی زد میں آئی تھی وہ انہیں بھی تغزل کے افلاس تک لے آئی ہے۔ یگانہ کی تنقید انانیت کے سانچے میں ڈھل گئی اور جمیل مظہری کی تنقید انکسار کے سانچے میں۔ نقصان دونوں صورتوں میں غالب کا ہوا۔ غالب سے جمیل مظہری کا شعری انتساب غلط نہ تھا۔

یہ بات ان کے معاصر ناقدین کو بہت واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ بقول نیاز:

"جمیل مظہری حضرت وحشت کلکتوی کے بڑے مشہور شاگرد ہیں.......... ان کی شاعری ...... حسن ذہن وفکر، تعبیر بلیغ کی شاعری ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت وہی ایک ایسے سخن گو ہیں جن کو دبستانِ غالب کا صحیح نمائندہ کہا جا سکتا ہے[۳]"

اور بقول مجنوں:

"ان کی شاعری میں شگفتگی میر کی ہے اور روانی انیس کی ہے لیکن تفکر اور بیان کی بلاغت کے ساتھ ساتھ ندرت غالب کا فیض ہے اور یہ ہونا تھا کہ وہ وحشت کلکتوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں[۴]"

یہی بات ایک اہم تحفظ سے جمیل مظہری نے کہی تھی۔

"میں دبستانِ غالب کا ایک طالب علم ہوتے ہوئے بھی "گفتۂ چند ز پیچیدہ بیان بمن آر" کا کبھی قائل نہ رہا لیکن اس کا کیا علاج کہ میرے ذہن کی الجھن میری غزلوں میں الفاظ و افکار کی الجھن بنتی رہی اور لوگ اسے اپنی سادگی سے فلسفہ سمجھتے رہے۔

ع فلطی ہائے مضامیں مت پوچھ "

ایک دوسرے موقع پر جمیل مظہری نے میر و غالب کا تقابل اس عنوان سے کیا:

"غالب کو آئندہ آنے والے زمانے کی روش کے معمار کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے مگر خالص شاعر کی حیثیت سے میر میں زیادہ صلاحیت تھی۔ وہ فلسفہ کی ثقالت سے غزل کو صاف بچا لے گئے ہیں۔ انہوں نے فلسفہ کو غزل کے مزاج میں ایسا گھلا ملا دیا کہ بالکل طلسمی چیز ہو گئی ہے"

بالکل آزادانہ طور پر محمد حسن عسکری اور سلیم احمد نے اس رائے کو بہت فروغ دیا لیکن فراق کے لئے برتری کا ایک پہلو نکالنے کے لیے۔ بعینہٖ جمیل مظہری کی درج بالا رائے بھی معروضی نہیں، خود احتسابی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اسے ایک تیسری عبارت سے ملا کر پڑھیں:

"میری غزلوں کا سرمایہ میرے چند بکھرے ہوئے افکار ہیں جنھیں آپ امداد امام اثر کی زبان میں اُمورِ ذہنیہ کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ ان اُمورِ ذہنیہ کو تغزل کا پیرایہ عطا کروں لیکن یہ سلیقہ مجھ میں کبھی نہ آیا۔ میرا ایک مطلع جو تنہا میری شہرت کا ذمہ دار ہے:

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا

"تغزل کی لطافت اس شعر کے دوسرے مصرعے کا تحمل تو کر لے گی لیکن بقدرِ پیمانۂ تخیل نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کا اسلوب"

بالآخر جمیل مظہری اس نتیجہ تک آہی گئے کہ ان کے والد کا مشورہ بالکل صائب تھا۔ غالب نے اُن کا ذوقِ سخن بھی بگاڑ دیا اور زبان بھی خراب کر دی۔ اس سعادت مندی کا جواب ہمیں جمیل مظہری کے اس شعر میں مل رہا ہے:

شغلِ فکرِ سخن و شوقِ نگارش معلوم
عقل جب توڑ دے پیمانۂ ذوقِ تحسیں

یہ اس قصیدہ کا شعر ہے جو غالب اور ممدوحِ غالب علی ابن ابی طالبؑ کی شان میں رقم ہوا تھا، جس میں غالب کو اس اہتمام سے خراجِ تحسین سے نوازا گیا تھا۔

سلکِ مضمون ہے کہ آئینۂ حسنِ بندش
حسنِ بندش ہے کہ سرمایۂ عقدِ پرویں
تیرے پیمانے سے سرخوش ہے کمالِ دانش
تیرے آئینہ میں حیراں ہے جمالِ خود بیں

شوق نے مانگ لیا تھا دلِ منصور و جنید
فکر نے چھین لیا تھا پرِ جبریلِ امیں
ہر صنم تیری خدائی کا طلب گار سجود
تیرا دیوان ہے اک عالمِ بت خانہ چیں
جام لیلے کے بڑھے تیرِ مجروح و ظفر
حالیٔ نوحہ گر و تفتۂ بت خانہ نشیں
مختصر یہ ہے کہ دو جزو کی چھوٹی سی کتاب
آیت اللہ ہے من جملۂ آیاتِ مبیں

تشبیبِ ثانی سے دو شعر دیکھتے چلیے۔ غالب اور مدّاحِ غالب کی ہم مزاجی و ہم رکابی کو جتانے کے لیے یہ کافی ہیں:

بسکہ دشوار ہے اشیا کی حقیقت کا سراغ
آسماں گردِ نظر زنگِ تصور ہے زمیں
عرش دیباچۂ تفصیلِ طلوعِ اسرار
فرش، آئینۂ ابہامِ ظہورِ خودبیں

رہی ممدوحِ اعلیٰ سے عقیدت، تو جمیل مظہری غالب کے ہم زبان و ہم قالب بن جاتے ہیں:

منقبت میں بھی ترا جوشِ بیاں حاصلِ ذوق
جس سے گنجینۂ معنی ہے قصیدے کی زمیں
حق ہے جو بھی کہے تو اے اسد اللّٰہی عشق
تیرے آقا پہ تصدّق یہ زبانِ تحسیں
یہ وہ ممدوحِ تصوّر ہے جو مانگے سجدہ
تو وہ مدّاحِ قلم کو جو بنائے ہے جبیں
یہ وہ میخانہ ہے بیٹھے ہیں جہاں جام بکف
چشتی و کرخی و جیلانی و جبریلِ امیں

یہ قصیدہ ۱۹۴۳ء کی تصنیف ہے۔ ممکن ہے کہ طرحی ہو کہ اس زمانے میں کئی اور اساتذہ بہ شمول آرزو لکھنوی نے قصیدے پیش کیے۔ اس سے بہت پہلے ۱۹۳۰ء میں جمیل مظہری نے اسی قصیدہ کی تضمین کی تھی۔ یہاں رنگ زیادہ گہرا ہے، جس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خواہ غالب بیدل سے بے نیاز ہو کر کسی اور تیج سے بھی غالب بن جاتے، لیکن جمیل مظہری غالب سے بے نیاز ہو کر نہ تو اپنی فکر کو شعور تک لا سکتے تھے اور نہ ہی ان کی ثقالت بلاغت کے درجے تک آسکتی تھی۔ ہم آہنگی کا یہ انداز مشاہیر شعرائے اردو کو نصیب نہ ہوا۔

بندگی جاہ پرستی ہے حلق تعظیم
سجدہ خودداریٔ مسجود کی قیمت ہے قدیم
نہیں جز عکس خرد آئینۂ خلق عظیم
مثلِ مضمونِ وفا بار بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

در پہ آیا ہے ترے لے کے غلامی کی سند
فارغ از دیر و حرم بندۂ گمراہ خرد
خارج از ملت و رد کردۂ درگاہ صمد
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

کیوں مرے ذوقِ سخن پر ہے فرشتوں کو عجب
ہاں مرا ناز غلامی نہیں پابندِ ادب
ناز وہ جس نے نہ دیکھی ہو کبھی چشمِ غضب
جرأت عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

عشق پہنچے ہے گلے میں جو غلامی کا طوق
یہ وہ جذبہ ہے جسے جذبۂ طاعت پہ ہے فوق
چشم کو خاک قدم کو جو ملے سرمۂ ذوق
طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

نشۂ جامِ ولا طبع کو گر دے مہمیز
ذوقِ بینش ہو فزوں نشۂ ادراک ہو تیز
لب فریاد بنے جوشِ دلِ شور انگیز
غمِ شبیرؑ میں ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

غرضیکہ غالب ہی جمیل مظہری کو قصیدہ سے مرثیہ تک لانے والے تھے۔ جمیل مظہری نے اپنی مرثیہ گوئی کا آغاز اسی سال کیا یعنی ۱۹۳۰ء میں ع ''عشق کیا ہے غمِ ہستی سے رہا ہو جانا'' چہرہ ہی کہہ رہا ہے کہ اردو مرثیہ بیانیہ کی حدود سے نکل کر فکری شاعری کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ میر انیس کے ارض میں غالب کا طول داخل کرنے والا شاعر طباطبائی کا غیر معمولی جوہر رکھتا تھا۔ آئندہ چل کر فکر و بیاں کی طنابیں ایک جنبش میں کھینچ دیتا تھا:

موجیں دریا کی ہیں خاموش ہوا نیند میں ہے
بے کسی چپ ہے گروہِ شہداء نیند میں ہے
ہر اسیرِ الم و رنج و بلا نیند میں ہے
سوئی ہے غیرتِ حق قہرِ خدا نیند میں ہے
کون پہرے پہ ہو بنتِ اسد ربؑ کے سوا
کوئی بیدار نہیں ہے دلِ زینبؑ کے سوا

وہ بھی غالب کے قرض سے غافل نہیں رہا:

آدمی زاد کب انساں ہے بقولِ غالب
استواری ہی میں ایماں ہے بقولِ غالب
سوزِ دل رازِ چراغاں ہے بقولِ غالب
درد خود معنئ درماں ہے بقولِ غالب
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کا فیضان قافیہ پیمائی تک محدود نہیں۔ جمیل مظہری کا وہ تصورِ عبادت جو مثنوی آب و سراب کا تہہ نشیں تصور ہے غالب کی بزمِ آگہی سے آیا ہے:

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنہار از آں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بہ سجودی و نبی را بدرودی

بایں ہمہ جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کو فکر انگیزی کے علاوہ آزادی کے شدید جذبے سے تحریک ملی تھی اور یہیں سے جمیل مظہری کی راہ غالب سے الگ ہونے لگی اور یہیں سے انھوں نے غالب کی روشن خیالی اور انگریز نوازی میں امتیاز برتنا شروع کر دیا تھا۔ قید فرنگ دونوں نے جھیلی مگر جمیل مظہری پر جو فرد جرم عاید کی گئی وہ سیاسی تھی۔ جمیل مظہری نے کبھی اس موضوع پر براہ راست اظہار نہیں کیا، لیکن غالب کے مربّی بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے موقعے پر، اسی لال قلعے میں جہاں غالب غزل سرا ہوتے تھے، جمیل مظہری کے دل سے فریادیوں بلند ہوئی:

میں شاعر ہوں سکوتِ شب میں سنتا ہوں کچھ آوازیں
نظر آتا ہے افسردہ گلستانِ وطن مجھ کو
میں سنتا ہوں کہ اک تربت کا مرجھایا ہوا سبزہ
یہ کہتا ہے بھگو اے ابرِ فیضانِ وطن مجھ کو

مگر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ جمیل مظہری کی شاعری بقول ان کے دبستانِ غالب میں پروان چڑھی اور ان کی افتادِ طبع کے لحاظ سے ان کے لیے اس سے بہتر کوئی راہ نہ تھی۔ جمیل مظہری بندگی و عاشقی میں غالب کی طرح خود دار تھے۔ لیکن بزمِ سخن میں غالب کے برعکس سراپا انکسار، لیکن غالب ان کے اس خاص رویے پر بھی اثر انداز ہو گئے، یہاں تک کہ انھیں عزتِ سادات کا پاس دلا گئے:

اب یہ مدحیہ قصیدہ کا صلہ دیکھ کہ آج
نسلِ ممدوح کی دیتی ہے خراج تحسیں

اور یہ دبستان محض غالب کے چمن میں جانے سے کھلا:

ز شعرِ عرفی و حافظ فسانہا تا کے
بہ مظہری نظرے کن کہ در زمانہ تست

فارسی گوئی کا یہ ذوق بھی حافظ کا نہیں، خاص غالب کا ودیعت کردہ تھا۔ یہ ان کے ایام جوانی کی ایک غزل تھی جس کے اشعار میں غالب کے مسلک کے ترجمان نظر آتے ہیں:

حذر ز پرسش رنگین دلبرانہ تست
کہ خونِ حسرتِ ما سرخیِ فسانہ تست
دلِ خراب کجا، شوقِ کامیاب کجا
نشاطِ او مگر از شوقِ بہانہ تست
بغیب باشی و ذوقِ شہود می بخشی
بخوابِ ہستی و عالم ہمہ فسانہ تست
بہ ہیچ شاخ نہ کردیم آشیاں مخصوص
شنیدہ ایم بہر شاخ آشیانہ تست

جمیل مظہری کی تعلّی اس فارسی مقطعے تک محدود رہی۔ ورنہ وہ اُردو میں اعتراف و اعتذار کی تکرار کرتے رہے:

ہے آب و رنگ سے خالی جمیل کی یہ غزل
ادب نہ اس کو سمجھیے کہ ہے یہ بے ادبی

کوئی کیفیت ہو اس میں تو سنے بھی سننے والا
یہ جمیل کی غزل ہے جو نہ نغمہ ہے نہ نالا

مستزاد یہ کہ اس انکسار پر ایک سایہ غالب کا نظر آجاتا ہے:

تمہاری اس غزلیت کو کیا کہوں میں جمیل
جو فلسفہ نہ بنی اور شاعری نہ رہی

گویا وقت کے ساتھ ساتھ جمیل مظہری کی شگفتگی میں آزردگی کی رمق شامل ہوتی گئی۔ یہ صورت کم وبیش ۱۹۶۹ء تک یعنی غالب صدی تقریبات تک قائم رہی۔ ان تقریبات کے بہانے جمیل مظہری کو غالب کے بارے میں عمر بھر کے تاثرات کا ازسرِ نو جائزہ لینے کا موقع ملا۔

ہم رہِ شوق میں ہوجائیں اگر تم سے پرے
تم ذرا چند قدم بڑھ کے صدا دے لینا

اس مرحلہ پر ان کی نظریاتی اساس بحال ہوگئی اور انھوں نے عالمِ تمکین میں غالب پر تین مضامین سپردِ قلم کیے جو یہاں آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ درمیان میں وہ

نظمیں بھی ہیں جو انھوں نے غالب کے حوالے سے کہیں۔

(۲)

"صاحب قصیدہ پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفریں ہے! پھر استاد کے شعر تضمین کیوں کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت نہ اس میں کوئی افزائش حسن تمہاری ۵"

یہ تھی جمیل مظہری پر غالب کی تنقید۔ مخاطب منشی ہرگوپال تفتہ، مصداق میاں جمیل مظہری شاعرے از خود رفتہ:

یک قلم نقدِ سخن مایۂ جیبِ دانش
سر بہ سر خاک قدم سرمہ بہ چشم تمکیں

اس نقدِ سخن کے باب میں جمیل مظہری کی مساعی کا کیا درجہ ہے؟ اس پر ان کے اہلِ وطن اہلِ قلم نے بارہا توجہ دی، لیکن ہر بار ع "بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق" کہہ کر الگ ہو گئے۔ اس صف میں ان کی نثر نگاری پر پہلی کتاب کے مصنف فضیل احمد اور ان کے منثورات کے مرتب اعجاز علی ارشد دونوں ہی شامل ہیں، جن کے نزدیک جمیل مظہری کے مضامین اسلوبی حسن سے تو مالا مال ہیں لیکن تنقیدی مغز سے تہی ۶۔ بلاشبہ! لیکن جب غالب کی تنقید شیفتہ جیسی نہ بن سکی تو جمیل مظہری کی تنقید کلیم الدین احمد جیسی کیونکر بن جاتی۔ شاعروں سے ہم رسمی تنقید کی توقع نہیں کرتے لیکن رسائی اور تازگی کی امید البتہ قائم رہتی ہے ۷۔ غیر رسمی تنقید کی ایک جھلک غالب کا وہ جملہ دکھا گیا جو ابھی آپ کی نظروں سے گزرا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ایک صفت غالب سے مستعار ہے، یعنی دونوں کے یہاں ادب کا افادی نظریہ ملتا ہے۔ غالب نے آئینِ اکبری کی منظوم تقریظ میں انھی قدروں کی ستائش کی تھی جو ان کے نزدیک ترقی کی ضامن تھیں۔ یہی موقف، بنیادی موقف، جمیل مظہری کا بھی تھا۔ یہاں انگریز دوستی یا انگریز دشمنی اضافی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جمیل مظہری کی اس نظریاتی جہت کا پاس سب سے پہلے ممتاز احمد نے کیا۔ اپنے تحقیقی مقالے اردو شعراء کا تنقیدی شعور میں انھوں نے نقشِ جمیل کی نظموں کی تشریح کی اور اپنے مضمون "جمیل مظہری کا تنقیدی شعور" میں انھوں نے عرفانِ جمیل کے مراثی کی تشریح کر کے جمیل مظہری کے نظریاتِ فن کو اربابِ نظر کے سامنے پیش کر دیا ۸۔

جمیل مظہری کی تنقید نگاری اشاعتی حادثات کا شکار رہی۔ ان کے ابتدائی تنقیدی نقوش اپنی نوعیت میں نظریاتی تھے۔ "مشہور جرمن فلسفی"، "جرمن ذہن کی تدریجی تعمیر"، "شبلی بحیثیت فلسفی"، "لٹریچر کے ذریعہ ہندوازم کی تعلیم" وغیرہ یہ وہ مضامین ہیں جو فضیل احمد کی تحویل سے نکل

کر سید نعمت اللہ کی تحویل میں آ گئے تھے مگر کتابی شکل میں اب تک نہیں آئے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد پیدا ہونے والی نسل ان سے واقف ہو سکے۔ اس زمانے کی تحریروں میں صرف دو تحریریں جانبر ہو سکی ہیں۔ ایک "اسلام اور نازیت" دوسری کل ہند ادبی کانفرنس کا خطبۂ استقبالیہ، جس کا انعقاد ۹ رجنوری ۱۹۳۶ء کو کلکتہ میں ہوا۔ یہ کانفرنس جو لکھنؤ کی ترقی پسند کانفرنس سے چند ماہ پیشتر ہوئی۔ جنوبی ایشیا کے سب سے بڑے شہر میں ہوئی تھی۔ اس کا اہتمام حسین شہید سہروردی نے کیا تھا اور صدارت مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے کی۔ مندوبین میں مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، مہاشے سدرشن، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر پرویز شاہدی اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری شامل تھے۔ اہلِ قلم کے اس نمائندہ اجلاس میں جمیل مظہری نے ادب کی ترقی کو ملک کی ترقی پر قربان کرنے کی سفارش کی تھی۔ اس تقریر کے بارے میں عتیق احمد کی رائے جمیل مظہری کے ہم وطن ناقدین سے کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ ہے:

> "انیسویں صدی کے آخر ہی سے سرسید اور ان کے رفقاء نے افادی ادب کی طرف متوجہ کرنے کی واضح بنیاد ڈال دی تھی، لیکن اس کلکتہ لٹریری کانفرنس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ جمیل مظہری کی کوشش سے یہ ہمارے ادب میں پہلی منظم اور اجتماعی آواز تھی جس نے ماقبل کی انفرادی کوششوں کو سہارا دیا اور آیندہ کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی بجادی[۱]۔"

اس ادبی کانفرنس اور غالب کی صد سالہ برسی کے درمیان ایک تہائی صدی حائل ہے۔ اس مدت میں غالبیات کے تنقیدی سرمائے میں جو اضافہ ہوا اس سے دنیا بے خبر نہیں۔ جمیل مظہری کی تنقید نگاری بھی سست رفتاری کے ساتھ بڑھتی رہی۔ بیشتر تو وہ احباب و تلامذہ کے تعارف میں مشغول رہے، جہاں ستائش کی گنجائش نکالنے کے لیے انھیں نظریاتی حوالے سے کبھی پہلوتہی اور کبھی روگردانی کرنی پڑی۔ اس دور میں جو مضامین آئے ان میں سب سے قیمتی ہے "مبارک کا آہنگِ شاعری"۔ جس میں مبارک عظیم آبادی کے حوالے سے آتش، داغ اور شاد کے اسالیب کے بارے میں بہت دقیق، بہت باریک اور بہت دور رس باتیں کی گئیں۔ "شاد کی استعاراتی شاعری"، اس سے بہتر اسلوبی مطالعہ ہو سکتا تھا، لیکن اس مضمون میں جمیل مظہری نے شرح نگاری کا پیرایہ اپنایا، جس سے یہ مضمون قدرے جامد ورمی ہو گیا۔ اس سے کہیں زیادہ تخلیقی شان یاس یگانہ پر ان کے مختصر مضمون میں نظر آتی ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری کا محاکمہ بصیرت افروز اور سیر حاصل ہے جبکہ ایک دوسرے شاگرد لطف الرحمان کی شاعری پر ان کی مختصر اور معاندانہ رائے نسلی تفاوت کی ایک حقیقی پیمائش ہے۔ میر انیس پر دو مضامین ہیں ایک تشنہ ہوتے ہوئے بھی بہت مفید، دوسرا مفصل ہوتے ہوئے بھی (اور تمام

تر احتیاط کے باوجود) بدمذاقی کا ایک مرقع۔ ''مصحفی کی جغرافیائی شاعری'' سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور مہیا کردیتی ہے۔ یہ شاید ان کا آخری مضمون تھا کہ آج کل میں خبر رحلت کے ساتھ شائع ہوا۔ نظریاتی تنقید کا آخری نمونہ ہے ''مجھے کہنا ہے کچھ'' ۔ یہاں ترقی پسند ادب کے ایک بانی نے جدیدیت پر اپنا موقف ظاہر کیا ہے۔ خصوصاً شمس الرحمان فاروقی کے حوالے سے۔ ان کے نزدیک تنہائی کا وجودی کرب لایعنی ٹھہرا لیکن جدت طرازی لائق ستائش ٹھہری۔ بس جمیل مظہری اس تمنا کا اظہار کر گئے کہ کاش جدیدیت صرف مشرقی نہیں مغربی زنجیروں کو بھی توڑ دیتی ۔ ذرا اس مضمون کی ترتیب بدل دیجیے:

غلام ہومر و ملٹن ہیں گر کلیم الدین
جمیل بندۂ فردوسی و نظامی ہے

غرض ادب کے ہر پہلو پر جمیل مظہری کی نظر ترقی پسندانہ ہے، بس ایک شعبہ افسانوی ادب کا ایسا ہے جس میں وہ ترقی کے مقابل نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں جمیل مظہری کی افسانہ نگاری ان کی شاعری سے کم مقبول نہ تھی اور ان کے ابتدائی تنقیدی آثار میں اختر شیرانی کے افسانوی مجموعہ آئینہ خانے میں پر ان کا مقدمہ بھی ہے۔ انھوں نے جو افسانے لکھے وہ ایک پیامی حاشیہ ضرور رکھتے تھے لیکن وہ فکشن میں عام دل چسپی بلکہ عوامی دل چسپی کو ایک بنیادی قدر جانتے تھے اور ان کی اسی خو نے ان کی تنقید نگاری میں ایک پیچیدگی پیدا کردی۔ انھوں نے جیمس جوائس کو اس صاف گوئی کے ساتھ رد کردیا کہ وہ صرف ذہانت کا امتحان لیتا ہے اور اس ضمن میں سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر کو بھی مطعون کر گئے۔ افسوس کہ انھوں نے اتنی اہم رائے کا اظہار ایک ایسے انٹرویو میں کیا جو صرف ایک ناقص انگریزی ترجمے میں دستیاب ہے۔ اس طرح سعادت حسن منٹو پر ان کے اعتراض کی نوعیت خاصی مبہم رہ گئی۔ ہاں ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے قرۃ العین حیدر پر چند جملے قدرے وضاحت کے ساتھ تحریر کیے ہیں:

> ''سب سے آخر میں قرۃ العین کے ''آگ کا دریا'' کی ابتدائی لہروں نے مجھے بے حد متاثر کیا لیکن جہاں سے ان کی یہ طویل کہانی عہد وسطی سے نکل کر عہد حاضر میں داخل ہوئی، وہیں مصنفہ اپنے من بھاتے ماحول میں گم ہوگئیں اور اپنے داستان کے مقصد اور تقاضوں کو بھی گم کردیا۔''

آگے چل کر انھوں نے اعتراف کیا کہ ''مسئلہ خیز اور فکر انگیز ناول جب میرے تھکے ہوئے دماغ پر بار گراں ثابت ہوئے تو مجھے سستے قسم کے ناولوں میں پناہ لینی پڑی۔'' یہ بات صاف اور سادہ ہے لیکن قرۃ العین حیدر پر ان کا اعتراض میرے لیے ناقابل فہم ہے، الا یہ کہ ان کا

کانگریسی ذہن آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے تاریک مستقبل کے مناظر کو قبول کرنے پر مائل نہ ہوسکا۔ ایک منکسر المزاج مصنف کا ایک تنقیدی وار جو جیمس جوائس سے لے کر قرۃ العین حیدر تک کے فن کا صفایا کر رہا ہو وہ خصوصاً منٹو کے حوالے سے مبہم رہ جائے، ایک سنگین اختلاف ہے۔ ظاہر ہے یہاں جمیل مظہری کا ادبی نظریہ سماجی اور سیاسی حوالے سے باہر آکر ایک جمالیاتی نظام کو حوالہ بنا رہا ہے۔ یہ ایک ہی ذہن اور ایک ہی ہنر کے اندر بیانیہ اور علامتی اظہار کے پیکار کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اسی تجزیہ میں جمیل مظہری کی اس درمیانی رائے کی کلید بھی تھی جس میں انھوں نے میر کو غالب سے برتر شاعر قرار دیا ہے۔

غالب پر جمیل مظہری کے مضامین اس پورے پس منظر میں ان کی شعری تنقید کا حاصل قرار پاتے ہیں۔ کاش وہ غالب کے فنی نکات کو بھی اتنی ہی توجہ دیتے جتنا کہ انھوں نے مبارک بلکہ کلیم عاجز تک کے فن کو دی تھی۔ لیکن غالب پر ابتدائی مضامین لکھتے ہوئے جمیل مظہری ذہنی طور پر کلکتہ کے اسی جلسہ گاہ میں موجود پائے جاتے ہیں جہاں ان کی تقریر پر مولانا حسرت موہانی اور مولانا شوکت علی کا مجادلہ مثنوی بادِ مخالف کے ہنگامے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ جمیل مظہری نے غالب کے اندازِ بیان کو نہیں اندازِ فکر کو موضوع بنایا ہے اور اندازِ فکر کا بھی وہ رخ ''جو معاشرے کی اصلاح'' اور ''نئی ذہنیت'' کی تجدید و تخلیق میں کارفرما تھی۔ پہلے دو مضامین کو ایک دوسرے کا تتمہ جانیے، ہاں آخری مضمون تقلیدِ غالب کی اسلوبی سرنوشت ہے۔ یہ راہ نئی تھی ہی جمیل مظہری ایک قدم اور آگے نکل گئے اور اردو نظم پر ہی نہیں اردو نثر پر بھی نظمِ غالب کے اثر کی نشاندہی کر گئے۔ یہ عبارت ہمیں اس فضا میں لے جاتی ہے جہاں:

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

عظیم آباد کے ان ستاروں میں وہ بھی تھا جس کی نسبت غالب سے وہی تھی جو غالب کو قتیل سے تھی اور ان میں وہ بھی تھا جس کی نسبت غالب سے وہ تھی جو غالب کو بیدل سے تھی۔ سخن شناسی کی یہ منزلیں فلک سے دور نہیں ہیں۔ اس بزم کو سجانے والے ان مضامین کی داد غالب ہی کی زبان میں دے رہے ہیں:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی یکم ستمبر ۲۰۱۲ء

حاشیے:

۱۔ اعجاز علی ارشد (م)، منثوراتِ جمیل مظہری ۲، پٹنہ: بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۲، ۲۷۳۔ آئندہ حوالوں میں صرف منثورات۔

۲۔ نیاز فتحپوری (م)، نگار لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۴۳۔

۳۔ مجنوں گورکھپوری، غالب شخص و شاعر، کراچی، مجنوں اکیڈمی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۸۔

۴۔ جمیل مظہری، عرضِ حال، فکرِ جمیل (م) رضا مظہری، رضا نقوی، پٹنہ مکتبۂ ادب، ۱۹۵۸ء، ص ح۔

۵۔ کلام حیدری و غیرہم (م)، سہیل جمیل مظہری نمبر حصہ اوّل، فکر و فن گیا، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۰۔

۶۔ منثورات، ص ۲۶۷۔

۷۔ مرزا غالب بنام منشی ہر گوپال تفتہ (م)، خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد اوّل)، کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء، ص ۳۳۲۔

۸۔ ''ادب کی بنیادی قدروں کی پیش کش کے سلسلے میں جس گہرائی، گیرائی، وسعت اور مفکرانہ و دانشورانہ رنگ و آہنگ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بات جمیل کے تنقیدی مقالوں میں پیدا نہیں ہو سکی ہے'' .... فضیل احمد، علامہ جمیل مظہری، حیات اور نثری تخلیقات کا مطالعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

۹۔ مضامین کی تنقیدی اہمیت زیادہ نہیں لیکن............ شگفتہ اندازِ بیان کے سبب ان کی یہ تحریریں یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔'' .... اعجاز علی ارشد (م)، منثورات، جلد ۱، ص ۲۵۔

۱۰۔ محمد رضا کاظمی، نقوشِ جوش، کراچی حیات اکیڈمی، ۱۹۹۵ء، تابِ سخن، کراچی مکتبۂ ادب، ۱۹۹۳ء۔

۱۱۔ ممتاز احمد، اردو شعراء کا تنقیدی شعور نیز جمیل مظہری کا تنقیدی شعور، آج کل (جمیل مظہری

نمبر)، راج نرائن راز (م)، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۲ء۔

۱۲۔ عتیق احمد، جمیل مظہری کا تنقید ذہن، ارمغانِ جمیل (م)، رشید منظر، کراچی مکتبۂ ادب، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۶۔

۱۳۔ آغا امام الدین احمد (م)، ڈائجسٹ ملت کالج بلیٹن۔ سالنامہ، دربھنگا، یکم ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۸۔۵۲۔

۱۴۔ منثورات، جلد دوم، ص ۲۸۰۔

۱۵۔ ایضاً

غالب — ایک مصلح فنکار

یہاں فنکار کے ساتھ مصلح کا لفظ ان ارباب ذوق کو چونکا دے گا جو فن کو تفریح طبع کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ فن برائے تفنن ہو یا برائے زندگی، لیکن آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ ہر عہد اور ہر ملک میں ایسے فنکار ہوئے ہیں اور شاید ہوتے رہیں جو اپنے معاشرے کے مزاج پر اثر انداز ہو کر اس کے ذہن اس کے ذوق اور اس کے تصور کا سانچہ بدلتے رہتے ہیں اور بعض اوقات پوری قوم کو ایک صحیح یا غلط سمت کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری تاریخ نے ان کے اثرات کو نظر انداز کر دیا ہو کیونکہ تاریخیں بنیادی طور پر انسان اور اس کے رجحانات کی کہانی بلکہ انسان کے اس خاص جذبے کی روداد ہیں جسے آپ اور ہم جذبۂ اقتدار اور جذبۂ تسلط کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ ہمیں یہ تو بتاتی ہے کہ سکندر کے جذبۂ تسلط نے کس طرح ایشیا کے ایک خطۂ عظیم کو زیر و زبر کر دیا اور نپولین کے جذبۂ اقتدار نے کس طرح یورپ کے سیاسی اور جغرافیائی حدود توڑ دیے لیکن وہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتی کہ شکسپیئر اور ملٹن کے لٹریچر نے کس طرح انگریزوں کی ایک مخصوص ذہنیت بنا دی۔ وہ ہمیں انقلاب کی کہانی تو سنائے گی لیکن اس انقلاب کے اندر جو روح کارفرما تھی وہ کن لوگوں کی بنائی اور جگائی ہوئی تھی، ان کا نام اس نے فراموش کر دیا ہے۔ اسے لوئی اور نپولین کے نام تو یاد ہیں لیکن والتیر اور روسو کا نام اس کے حافظے سے محو ہو چکا ہے۔ وہ ہمیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عظیم جنگوں کے تباہ کن افسانے تو سنا دے گی لیکن یہ نہیں بتلائے گی کہ اس عالمگیر تباہی کی کتنی ذمہ داری مشہور جرمن فلسفی نیٹشے کے ادبیات پر ہے جس نے جرمن قوم کی اقتدار پسند ذہنیت کی تعمیر کی اور دماغوں میں بارود بھر کر کس طرح دنیا کو دو مرتبہ آگ اور خون میں نہلایا۔ وہ آپ کو ایران کے ان شہنشاہوں اور ان فاتحوں کا حال تو بتائے گی جنہوں نے اس ملک کے ایک نظام کو الٹ کر دوسرا نظام

قائم کیا لیکن آپ اس سے پوچھیں گے کہ وہ شاعر کون تھا جس نے اس قوم کے اندر ایک قومی شعور پیدا کر کے ایران کے نئے ذہن کا سانچہ بنایا تو شاید وہ آپ کو اس کا نام بھی نہ بتلا سکے گی۔ اس لیے ہم کیوں اس سے پوچھیں کہ غالب کون تھا اور اُردو بولنے والے ہندستان کے موجودہ تہذیبی اور ذہنی ارتقاء میں اس کا کیا حصّہ ہے؟

غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہر زاویے سے اس کے ادبی قد و قامت کی بلندی ناپی جا چکی ہے لیکن ہماری تاریخ تو تاریخ ہے، ہماری نئی تنقید نے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اس کی شاعری اپنے پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کے دماغ پر کس طرح اثر انداز ہوئی اور اس کے "دو جزو کے مختصر دیوان" میں انقلابِ فکر اور انقلابِ ذوق کے کتنے امکان ہیں؟ اور اس امکان نے کس طرح ہماری نئے ذہن کا سانچہ تیار کرنے میں حصّہ لیا۔ ہم تو صرف ابھی تک اس کے اسی رخ کا جائزہ لے جا رہے ہیں کہ "غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔"

اس کے اندازِ بیان کی ندرت مسلّم لیکن اس کے اندازِ فکر کی جو ندرت ہے اس کے دیکھنے کی فرصت ہمارے نقادوں کو ابھی تک نہیں ملی۔ اس کے اندازِ فکر نے کس طرح ہمارے ذہن اور ہمارے ذوق کے سانچے کو غیر محسوس طور پر بدلا اس کی گواہی دینا تو دور کی بات ہے اگر اس کی طرف کوئی خفیف سا اشارہ بھی کر دے تو اس کا اشارہ ایک مضحکہ خیز بات بن کر رہ جائے گی۔ آج غالب کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو انکار نہیں لیکن اس کا اعتراف ہم میں سے کم لوگوں کو ہے کہ اس کی شاعرانہ عظمت نے اُردو شاعری کو کس طرح ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا اور اس حیثیت سے تو غالب کے فن کو پرکھا ہی نہیں گیا ہے کہ اس میں معاشرے کی اصلاح اور نئی ذہنیت کی تجدید و تخلیق کے کتنے امکانات ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت اُردو شاعری میں غالب کا عہد آفریں کارنامہ فکر و نظر کا وہ انقلاب ہے جس کی آہٹ ایک حسّاس ذہن ان کے دیوان کے ہر صفحے پر سن سکتا ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب، بلکہ کتابوں کی ضرورت ہے، یہاں تو صرف چند اشارات ہی کی گنجائش ہے۔ پہلے اس کے تصورِ عشق کی انفرادیت کو لیجیے جو آپ اپنا نفسیاتی تجزیہ یوں کرتی ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

یہاں غالب جذبۂ پرستش اور جذبۂ عشق کے درمیان ایک امتیازی نشان کھینچ کر اپنے عہد کی اس بدمذاقی کے خلاف ایک احتجاجی اشارہ کر رہا ہے جس نے ایک جنسی جذبے کو عبادت کا درجہ دے کر عقل و جنون کا امتیاز ہی مٹا دیا تھا اور معاشرے میں ایک ایسا رجحان پیدا کر دیا تھا۔ جس سے قوم

کے قوائے عملیہ کو گھن لگا جا رہا تھا۔ شاعروں نے اور شاعروں سے زیادہ صوفیوں نے نوجوانوں کو یہ کہہ کر بہکا دیا تھا کہ عشق بندگی کی ایک ارتقائی سیڑھی ہے اور ایک ایسا محترم جذبہ ہے جو ایک انسان کے تمام اخلاقی اور روحانی امراض کا علاج کر کے بتدریج اس کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

مولانائے موصوف کے بعد فارسی اور اُردو کے جملہ شعراء ان کے اس قصیدۂ عشق کی تشریح کرتے رہے اور اپنے عہد کے نوجوانوں کے اس جذبے کے اندر گم ہوجانے کی ترغیب دیتے رہے لیکن غالب ایشیا کا پہلا شاعر اور پہلا مفکر تھا جس نے بہانگِ دہل اس رجحان، اس میلان اور اس عقیدے کے خلاف یہ اعلان کیا:

ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ملاحظہ فرمائیں آپ اُردو شاعری کا یہی وہ موڑ ہے جہاں سے ایشیا کے اس عظیم مفکر نے اپنے عہد کے ذہنوں کو ایک نیا اشارۂ رہنمائی دے کر شاہراہِ ارتقا پر قافلۂ فکر و نظر کی سمت ہی بدل دی۔ ایشیا ہی نہیں شاید دنیا کے کسی شاعر، کسی مفکر اور کسی فلسفی نے عشق اور خودداری کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس مسلکِ خاص میں بھی غالب شعرائے عظیم کی صف سے الگ کھڑے ہو کر اپنا یہ پیغام دنیا کو سنا رہے ہیں۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غالب کے مشرب میں عشق اسی حد تک گوارہ ہے جہاں تک یہ جذبہ عاشق کی انا کو مجروح نہ کرے۔ جہاں انانیت مجروح ہوتی ہے، غالب وہاں سے عشق کو پچھلے پاؤں لوٹنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ محبت ان کے خیال میں محبت کے لیے کرنی چاہیے۔ جس دروازے سے محبت کے بدلے نفرت ملے وہاں سر جھکانا اور سنگِ آستاں سے سر پھوڑنا غالب کی نظر میں وقارِ انسانیت کے منافی ہے۔ یہ تو

عشق کی منزل ہے۔ غالب تو بندگی کی منزل میں بھی اپنی انا کی حفاظت کرتے نظر آتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جو شاعر معاملۂ بندگی میں خدا کے سامنے بھی خوددار ہو وہ معاملۂ عشق میں معشوق کی ناز برداری کہاں تک کر سکتا ہے۔ وہ کیسے یہ گوارہ کرے گا کہ کسی انسان کا جذبۂ عشق اتنا اندھا اور اتنا معذور ہو جائے کہ معشوق کی حکم سے اس کی طرب گاہ کی تعمیر میں مزدور کی خدمت انجام دے:

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

میر کوچۂ عشق میں عزت سادات گنوا کر اس نوبت پر پہنچ جائیں تو پہنچ جائیں کہ

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
اِدھر آبے، ابے او چاک گریباں والے

لیکن غالب کوچۂ عشق کو کوچۂ ملامت سمجھ کر وہاں جانے کے خیال ہی سے گھبراتے ہیں اور جب اُن کا دل زبردستی انہیں اِدھر کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے تو کس حیرت اور کس مجبوری سے یہ اعتراف کرتے ہیں۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

یہ بت خانۂ دماغ نہیں جس کے "اصنامِ خیالی" کو غالب اپنے قلم کی ضرب سے پاش پاش کریں۔ یہ پندار کا صنم کدہ ہے جس کے ٹوٹنے کے تصور ہی سے غالب کا خوددار دل تھرتھرا رہا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

جب ہم اس شعر میں لفظ فرصت پر غور کرتے ہیں تو یکا یک چونک پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عاشق جس کا جذبۂ جنسی عشق کی معراج پا کر ماسوا معشوق کے ساری دنیا سے بیگانہ ہو چکا ہے اس کے لیے عدیم الفرصتی کا کیا سوال ہے۔ غالب کے معاشرے میں تو ایک عاشق کے لیے فرصت ہی فرصت تھی کیونکہ بقول حالی

جنھوں نے لگائی ہو لو دل رُبا سے
غرض کیا رہی پھر انھیں ماسوا سے

لیکن غالباً غالب ایشیا کا نہ سہی اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے غمِ عشق کے مقابلے میں غمِ روزگار کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ اس شعر میں وہ اُن بدقسمت انسانوں کو دیکھ رہا ہے جنھیں افکار و آلام کے ہجوم میں اتنی فرصت بھی مشکل سے ملتی ہے کہ ع بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔

یہاں غالب اس کارگاہِ سود و زیاں کے ان تقاضوں کو گن رہا ہے جن کی موجودگی میں ایک حساس انسان اگر مجنوں کی طرح عشق کا حق ادا کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

تم کو بھی ہم بتائیں گے کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اور کشاکشِ غمِ دنیا سے فرصت ملے تو کیونکر ملے جبکہ

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

غور سے سنیے یہ اٹھارہویں یا انیسویں صدی کے ہندستان کی آواز ہے یا بیسویں صدی کے اس دنیائے گرد و باد کی ایک صدائے بے اختیار جس میں زندگی کا ہر تقاضا ہر فرد سے اپنا حق مانگ رہا ہے۔

ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

فیض کا یہ مصرع غالب کی اس آواز کی ایک توضیحی گونج ہے جو اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ ایسی آواز اس عہد میں جس کے گلے سے بھی نکلے جس سینے سے بھی اُبھرے غالب کی آواز ہے۔

صفی اور عزیز کا کلیات ہو یا وحشت و حسرت کی بیاضِ سخن، اصغر و جگر کا دیوان ہو یا غالب کے دشمن یگانہ اور ان کے استاد شاد کا کلام ان کے اوراق الٹیے اور دیکھیے کہ غالب کہاں کہاں اور کس کس کے بھیس میں آواز بدل بدل کر بول رہے ہیں یہی ہے اُردو غزل کا وہ ذہنی اور فنی انقلاب جو دیوانِ غالب کے سائے میں پل کر پروان چڑھا۔

غالب نے ہمارے احساسات کی تربیت کی ہماری سوچنے کا انداز بدلا اور جب سوچنے کا انداز

بدل گیا تو کہنے کا انداز کہاں تک اپنی وضع قدیم پر قائم رہتا عشق کا مزاج بدل گیا تو عاشقانہ شاعری یعنی تغزل کا مزاج بدلتے کتنی دیر لگتی۔ ابھی غالب کی موت پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دانائے روزگار اور ایک حکیمِ مشرق نے غالب ہی کے دبستانِ فن سے نکل کر اُردو غزل کا ڈھانچہ ہی بدل دیا۔ اب عشق وہ عشق نہیں تھا۔ اب عشق وہ عشق نہیں جو سودا جیسے دبنگ شاعر کو بھی (جو ہجر کی حالت میں اپنی بالیں پر خدامِ ادب کو کھڑا کرتا ہے۔) معشوق کی گالیوں کے جواب میں اس طرف منفعل بنا دیتا ہے۔

جھڑکی تو مدّتوں سے مساوات ہوگئی
گالی کبھی نہ دی تھی سو اک بات ہوگئی

اب تو عشق و معشوق میں مساوات ہوگئی۔ عاشق و معشوق کے تعلقات باہمی اس سطح پر آگئے جہاں سے عاشق معشوقِ حقیقی کو بھی اس طرح جھڑک لیتا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ حال صرف اقبال ہی کا نہیں مزاجِ عشق کی یہ نوک پلک آپ بیسویں صدی کے ہر عظیم غزل گو کے یہاں پائیں گے اور یہ براہِ راست غالب ہی کا فیضان ہے مگر غالب نے صرف عشق ہی کا مزاج نہیں بدلا وہ اپنے معاشرے کے عام معاشرتی رجحان سے بھی مطمئن نہیں اور اسے بدلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف عاشق و معشوق ہی میں نہیں انسان اور انسان میں مساوات چاہتے ہیں۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے فرہاد کو صرف اس بنا پر کہ وہ ایک مزدور پیشہ ہے بلند مرتبہ عشاق کی اس صف سے الگ کھڑا کیا جائے جس میں خسرو پرویز اور سلیم جہانگیر بھی کھڑے ہیں۔

تیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

تیشے میں عیب نہیں۔ یہ جملہ بھی غور طلب ہے۔ یہ اس معاشرے کی آواز ہے جہاں پہ پیشہ کو عیب سمجھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ تجارت کو بھی جہاں ایک بڑا تاجر بھی ایک چھوٹے سے چھوٹے جاگیردار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ وہاں غالب عاشق ہونے کی حیثیت سے ایک معمار کو ایک شہنشاہ کے پہلو میں جگہ دے رہے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے آپ دیکھ چکے ہیں کہ غالب کی خودداری وہاں فرہاد کی حمایت نہیں کرتی جہاں وہ ایک گرسنہ مزدور کی حیثیت سے طرب گاہِ رقیب کی

تعمیر میں مصروف رہ کر عشق کی انانیت ضائع کر رہا ہے اور پھر اس کے علاوہ غالب میاں فرہاد سے اس بنا پر بھی خوش نہیں ہیں کہ وہ "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا" اور خودکشی کا کوئی جدید طریقہ ایجاد نہ کر کے جان دینے کے لیے پرانے وسائل اختیار کر رہا تھا اور ان کی ناخوشی کا ایک سبب اور بھی ہے کہ وہ تیشہ بغیر نہ مر سکا محبوبہ کی خبرِ مرگ سن کر تو اسے خود بخود مر جانا چاہیے تھا۔ کسی وسیلے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی ہے غالب کے ذہن کی وہ انقلاب پسندی جو اپنے عہد کے رسوم پرست معاشرے سے ہر جگہ بیزار نظر آتی ہے۔

عشق تو عشق مذہب میں بھی رسومات کا دخل انہیں پسند نہیں تھا۔ کہتے ہیں:

ع ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

لیکن یہ رسوم پرستی اگر وفاداری کی شدت کو ظاہر کرے تو غالب کی بصیرت اسے ایک حد تک جائز سمجھتی ہے:

نہیں کچھ سُبحۂ زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

ملاحظہ فرمایا آپ نے غالب کے طبعِ انقلاب پسندی کی اعتدال پسندی کو جو رسومات کے جواز اور عدم جواز کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال پیش کر رہا ہے اور برہمن کو بھی مسلمانوں کی طرح خدا پرست مان کر کعبہ میں دفن کرنے کا فتوا دے رہا ہے:

وفا داری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

کعبے میں برہمن کو اس لیے گاڑو کہ اصلِ ایمان تو وفاداری بشرطِ استواری ہے اگر برہمن کا ایمان بت پرستی ہی کو خدا پرستی سمجھ کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے مسلک پر قائم رہے تو اس کے وہ سجدے بھی جو اصنام کے قدموں پر بکھیرے گئے ہیں۔ ہرگز ضائع نہ جائیں گے اور براہِ راست نہ سہی ایک وسیلے سے خدا تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے مسلک پر استواری سے قائم نہ رہے اور تبدیلیٔ مسلک کی ضرورت محسوس کرے تو یہ غالب کی نظر میں اس کے ایمان کی کمزوری ہے اور غالب کے ایک مقلدِ ادبی کی نظر میں بمنزلہ کفر ہے:

کفر کیا ہے؟ حرم و دیر کی تفریق جمیلؔ!
سخت کافر ہے وہ ہندو جو مسلمان ہوجائے

یہ ہے رواداری کا پیغام جو نئے ہندستان کو غالب نے دیا۔ ان اشعار کی موجودگی میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ غالب نے ہندستانی قومیت کی تعمیر کے سلسلے میں جو کچھ [کیا وہ یاد] نہیں رکھیں گے جو نیا ہندستان اُن کی صد سالہ برسی جوش و خروش سے منا رہا ہے وہ غالب کا قرض تھا۔ جسے ہندوستان کی نئی جمہوریہ کو بہر حال ادا کرنا تھا۔

مذہب کے غلط تصور نے غالب کے معاشرے کو جس شدت کے ساتھ تقلید پرست بنا رکھا تھا۔ غالب جیسے مصلح کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی تھی جو اُس نے اس سلیقہ سے کی:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ ایک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

غالب ایک بزرگ کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہوئے ہر قدم پر اُس کی پیروی کو آزادیٔ فکر و نظر کے منافی سمجھتے ہیں اور اس عہد میں سمجھتے ہیں جہاں مذہب تو مذہب ہر پیشہ اور فن میں تقلید پرستی نفس کی صالح انانیت کو مجروح کر رہی تھی۔

غالب نے ہمارے ذہنوں کو تعقل کی آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع دیا اور ہندستان کے مسلمان ذہنوں کو تقلید کے حبس سے نکالا آج جو مسلمانوں کا تعلیم یافتہ گروہ غالباً غیر مقلد نہ ہوتے ہوئے بھی کسی پیر کے حلقۂ بیعت میں داخل نہیں ہے وہ بھی غالباً غالب کا فیضان اور اُن کی تعقل پسندی کی دین ہے۔ کیونکہ غالب اپنے ہر قاری کے ذہن کا سانچہ بدلتا ہے اور اس انداز سے بدلتا ہے کہ تاریخ کو بھی اس تبدیلی کی آہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں ہماری ذہنیت کے جو معمار ہوئے اُن کے ذوقِ طبیعت کی تربیت بھی اس دبستانِ فن میں ہوئی۔ حالی و شبلی ہوں یا ابوالکلام آزاد ہوں یا مولانا محمد علی جوہر، نیاز فتح پوری ہوں یا سجاد حیدر یلدرم، ڈاکٹر ذاکر حسین ہوں یا رشید احمد صدیقی، جوش ہو یا غالب کے سب سے بڑے مقلد اقبالؔ، ان سب کی زندگی کے ابتدائی نشو و نما کا جائزہ لینے والا خود بخود اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان کی ذہنیت کے قصرِ رفیع کا بنیادی پتھر غالب ہی کا رکھا ہوا ہے۔ اور تو اور اگر ہمارے احباب علی گڑھ کی پیشانی پر شکنیں نہ پڑ جائیں تو ہم کہنے کی جرأت کریں کہ نئے حالات سے سمجھوتہ کرنا سرسید نے غالب ہی سے سیکھا ورنہ سرسید تو طبیعتاً وہی سرسید تھے جنھوں نے اُن کی منظوم تقریظ کو نسخۂ آئینِ اکبری میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ ہماری قومی اور ملی زندگی کے لیے آمدِ فکر و عمل غالب ہی نے فراہم کیے تو اسے مبالغہ سمجھنا حقیقت پر ظلم ہوگا۔ بلاشبہ غالب کی شاعری نے ہمارے معاشرے کی بڑی حد تک

اصلاح کی اور ہمارے سوچنے کا انداز بدل کر ہم میں ایک نیا شعورِ حیات پیدا کیا۔ یہ چند اشعار جو اس مقالے کی بنیاد ہیں غالب کی عظمتِ فکر کے چند معمولی نمونے ہیں جن پر سرسری طور پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ورنہ ضرورت یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر غالب کے دیوان کی ایک شرح جدید لکھی جائے اور ان تمام موتیوں کو نئی ترازو پر رکھ کر تولا جائے جنھیں زمانے کی کم نگاہی نے خذف سمجھ کر دریا کے کنارے ڈال دیا تھا۔ میری آرزو ہے کہ ملک کے عظیم اہلِ قلم اس کی طرف متوجہ ہوں میں کلیم الدین احمد، آلِ احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی اور احتشام حسین اور اپنے اختر اورینوی کو دعوت دیتا ہوں:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے!

مثلّث

میرا سلام غالب عرفاں سرشت کو
طاعت میں ہے ریا تو سزا کیوں بہشت کو
دوزخ میں جھونکو مسجد و دیر و کنشت کو

سمجھے گی کیا ہوس اثرِ خوب و زشت کو
للچایا جلوہ گاہ بنا کر بہشت کو
بدلا نہ میرے ذہن تماشا سرشت کو

دانش نے دین و دہر کی صورت بدل تو دی
تہذیب نے جنوں کی طبیعت بدل تو دی
لیکن بدل سکی نہ خرد کی سرشت کو

توحید اور تصور ہند و عجم کا روپ
توصیف دے رہی ہے خدا کو صنم کا روپ
دو تعزیت حرم کو بشارت کنشت کو

شاید خدا کا قرض چکا دے خودی کا عزم

آدم کو تہنیت ہو کہ اب آدمی کا عزم
جنت بنائے گا اسی دنیائے زشت کو
غالب کی اتفاق سے کج ہوگئی نظر
ورنہ بخطِ راست ہے انسان کا سفر
سیدھا لگا تھا قط قلم سر نوشت کو
وہ مسجدوں کی اینٹ ہو یا صومعے کی اینٹ
بتخانہ و حرم میں ہے ایک دوسرے کی اینٹ
پہچانتے ہیں اہلِ نظر خشت خشت کو
ایمان ہے شکوک کے عالم میں واعظو
ہم جن کو کر کے جائیں جہنم میں واعظو
جنت میں تم کرو انہی افعالِ زشت کو
سمجھیں کہ موج آگئی ہے سلسبیل کی
ساقی نے توڑ دی ہے صراحی جمیل کی
سیراب کرلیں دانش و دیں اپنی کشت کو

انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن

بیاورید گر اینجا بود زباندانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

یہ شعر نہیں ایک کراہ ہے، ایک فریاد ہے، ایک ایسے آدمی کی فریاد جو اپنی دنیا سے بھٹک کر دوسری دنیا میں آ گیا ہے۔ جو اکیسویں صدی کی مخلوق ہو اور وقت سے پہلے انیسویں صدی میں آ کر انیسویں صدی کے لوگوں میں اپنے کو اجنبی محسوس کر رہا ہو۔ جو کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن سننے والے اس کی زبان سمجھ نہیں پا رہے ہوں اور وہ گھبرا کر کہہ رہا ہو کہ اس دیار میں کوئی میری زبان سمجھنے والا ہو تو اس کو بلاؤ جو ہماری بات اس دیار کے لوگوں کو سمجھا دے۔ غالب اور اس کی شاعری کا المیہ یہی ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بحث یہ آتی ہے کہ آخر غالب کے ہم زبان اس کی زبان کیوں نہیں سمجھ پائے۔ کیا اس لیے کہ وہ زبان مشکل تھی؟ یا اس لیے کہ اس کا طرز بیان پیچیدہ تھا؟ دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ممکن نظر نہیں آتی اگر غالب کی زبان فارسی آمیز تھی تو ان کے ماحول میں کون شخص ایسا تھا جو فارسی سے نا آشنا تھا؟ بچے سے لے کر بوڑھے تک، خواص سے لے کر عوام تک کم و بیش فارسی داں تھے، اُردو اگرچہ ان کی مادری زبان بن چکی تھی، لیکن روزانہ کی گفتگو میں فارسی بہرحال مستعمل تھی اور مراسلت تو اس عہد میں صرف فارسی ہی ہوا کرتی تھی۔ فارسی کا بولنا اور لکھنا شرافت اور برتری کی سند سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسے دور میں کسی کا فارسی آمیز کلام قابل فہم کیوں نہیں سمجھا گیا؟ اس کے علاوہ دوسری بات کا بھی امکان نہیں ہے۔ غالب کا کلام بلاشبہ اپنی تراکیب و بندش کے لحاظ سے پیچیدہ تھا لیکن جو لوگ خاقانی کا ادق کلام سمجھ کر اس کی معنی آفرینی پر عش عش کر

سکتے تھے وہ غالب کا کلام کیوں نہ سمجھ پائے؟ غالب بلاشبہ معنی آفرینی میں بیدل کے تتبع تھے۔ لیکن جو لوگ بیدل کی معنی آفرینی پر سردھن رہے تھے انھوں نے غالب کو ایک مہمل گو کیسے کہہ دیا؟ آخر غالب کے ہم عصروں میں مومن بھی تو ایک مشکل گو شاعر تھے۔ جن کی کہی ہوئی پہیلیاں آج بھی مشکل سے بوجھی جا رہی ہیں۔ آخر ان کے ہم چشموں نے ان کو مہمل گو کے لقب سے کیوں نہ نوازا؟ کسی آغا جان عیش نے ان کو مخاطب کر کے اس طرح طنز کیوں نہیں کیا؟ صرف غالب ہی اس طنز کے مستحق کیوں سمجھے گئے؟

مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
اگر اپنا کہا تم آپ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بہرحال یہ سوال آج ہمارے لیے غور طلب ہے کہ غالب کے خاص پڑھے لکھے ہم عصر ان کا کلام کیوں نہ سمجھ پائے؟ ہم اس سلسلے میں جب غور کرتے ہیں تو سوائے اس نتیجے کے کسی دوسرے نتیجے تک پہنچ نہیں پاتے کہ غالب کا انداز بیان ان کے لیے ناقابل فہم نہیں تھا بلکہ غالب جو کچھ کہہ رہا تھا وہ باتیں ان کے لیے ناقابل فہم تھیں۔

انیسویں صدی کے ذہن کے سانچے میں وہ او تکارات نہیں سکتے تھے۔ جنھیں غالب کی شاعری زبردستی اُتانا چاہتی تھی۔ یہ نکتہ خود غالب کو بھی ذرا دیر سے سمجھ میں آیا اور جب سمجھ میں آیا تو انھیں یہ کہہ کر صبر کرنا ہی پڑا۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یہ نہیں ہے کہ ان کے ہم عصر ان کی کہی ہوئی باتوں کو کلیتہً سمجھ نہیں پاتے بلکہ بعض باتیں جو سمجھ میں آتی تھیں وہ بھی ان کے لیے ناپسندیدہ تھیں کیونکہ ان کا ذہن جن مضامین حسن و عشق کے سننے اور سمجھنے کا خوگر تھا غالب ان کے برعکس باتیں مسلسل کہے جا رہے تھے۔ ان کا تقلید پرست معاشرہ آخر ان کی بغاوت کو کہاں تک برداشت کرتا۔ وہ عشق کو ایک مقدس جذبہ سمجھتے تھے غالب نے اسے ایک ذلت نفس بلکہ حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کا شاعرانہ ایمان یہ تھا کہ عشق کی بلند ترین سطح وہ ہے جہاں عاشق کے دل میں ماسوا معشوق کے کسی اور چیز کا نہ تصور ہو اور نہ احساس۔ لیکن غالب اس بلند سطح پر پہنچ کر بھی یہ اعلان کرنے پر مصر تھے۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

گرانباریٔ زنجیر کا احساس غالب کے معاشرے کی نظر میں عشق کا ضعف اور عاشق جذبۂ شوق کا نفسیاتی تصور تھا۔ وہ اپنے نوجوان لڑکوں کی تربیت مسجد و مدرسہ کے حدود میں نظر بند رکھ کر کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کی نوجوانی ریش کے سائے میں یا زیادہ سے زیادہ کسی زلف کے چھانو میں آسودہ رہ کر شرافت کے معیار کی قدر کرنا سیکھے۔ غالب انھیں زلف و ریش دونوں کے عقیدوں سے نکال کر آزادی کی کھلی ہوئی فضا میں آوارگی کی دعوت دیتے رہے کیونکہ ان کی نظر میں ذہن کا ارتقاء بغیر آوارگی کے ممکن ہی نہ تھا۔ اس لیے

ع چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ورنہ ذہن "تنگیٔ چشمِ حسود" میں گھٹ کر رہ جائے گا۔ اس تبلیغ کے سلسلے میں وہ اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

ظاہر ہے کہ مسجد و خانقاہ کی نظر بندی ایک نوجوان کو ایک مسجد کا ملا یا ایک خانقاہ کا پیر تو بنا سکتی تھی غالب نہیں بنا سکتی تھی۔ یہی تھیں غالب کی وہ زہریلی باتیں جو ان کے اہلِ معاشرہ کو کڑوی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن داد دینی چاہیے ان کی رواداری کی کہ وہ سن کر چپ رہ گئے اور نوجوانوں کو بہکانے کے الزام میں سقراط کی طرح عدالت سے غالب کے لیے زہر کا پیالہ نہیں تجویز کرایا حالانکہ غالب علاوہ دعوتِ آوارگی کے نوجوانوں کو خضرِ طریقت کی تقلید سے بیگانہ بنا کر ان کے معاشرے کی بنیادی اینٹیں ہلائے دے رہے تھے اور انھیں جاگیرداری کی اونچی سطح سے گرا کر پیشہ ورانہ کمال کی طرف راغب کر رہے تھے:

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

مشکل یہ تھی کہ وہ لوگ غالب کی ان باتوں کو شاعری بھی نہیں سمجھ سکتے تھے جو لوگ معشوق کے

چہرے میں خدا کا جلوہ دیکھنے کے خوگر ہوں وہ کیسے سمجھ سکتے تھے کہ معشوق کا ناز ایک التجا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے سمجھ سکتے تھے کہ اختراعِ جلوہ کی ہوس میں آئینۂ محبوب کے لیے ایک زانوئے فکر بھی بن سکتا ہے۔ جنھوں نے تبسم کو صرف علامتِ خوش دلی سمجھا ہو وہ تبسم پژمردگاں کی الجھی ہوئی نفسیاتی ترکیب کو کیسے سراہ سکتے تھے۔ وہ نگاہیں جو "جواہر طرف کلہ" پر قربان ہوجانے کی عادی ہوں "وہ روحِ طالعِ لعل و گہر" کو لکھنے کی دعوت کیسے قبول کر سکتی تھیں۔ وہ تماشائے گلشن اور تمنائے چیدن کو کیسے لازم و ملزوم سمجھ سکتی تھیں۔ وہ کیسے گوارا کر سکتی تھیں کہ ایک شاعر انسانیت کا وکیل بن کر خدا کی عدالت میں یوں جرح کرے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ کیسے یقین کر لیتے کہ کسی بے وفا سے محبت کرنا آپ اپنے سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ ایک بے وفا کے لیے جان دینا اور جان دے کر خدا تک پہنچنا ان کی شاعری کا ایمان تھا۔ غالب ان کے اس ایمان کا پیہم مضحکہ اڑائے جا رہے تھے۔ یہ اگر بغاوت نہ تھی تو اسے کیا کہا جائے۔ نقادِ جلیل اور محبِ جمیل، آلِ احمد سرور غالب کو باغی کہنے پر راضی نہیں۔ غالباً موصوف بغاوت صرف ایسی سیاسی خلفشار کو سمجھتے ہیں جو سماج کو سیاست کا دنگل بنا دے لیکن ایک نئی تحریکِ ذہنی، جو سماج کا ڈھانچہ بدلنا چاہتی ہو، کو اگر بغاوت کہا جا سکتا ہے تو غالب بدرجہ اتم باغی تھے۔ ہر چند ان کی بغاوت لفظ و معانی کے دائرہ سے نکل کر عمل کے حدود میں کبھی نہ آئی فکر و نظر کی بغاوت کو جانے دیجیے صرف تغزل ہی کو معرضِ بحث میں لایئے اور دیکھیے کہ ان کی باغی روح ان کے دیوان کے مختلف گوشوں سے کس طرح جھانک رہی ہے۔ غالب کے تغزل کا مزاج کس حد تک باغیانہ تھا۔ اس کا اندازہ آپ کو قدیم عرب ناقد ابنِ قدامہ کی اس رائے سے معلوم ہوگا جس کو اس نے عربی تغزل کا سانچہ ڈھالتے ہوئے پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی اپنی کتاب شعر الہند میں اس کی توضیح یوں فرماتے ہیں:

"وہ غزل جس سے غزل کا مقصد پورا ہوتا ہے وہ ہے جس میں عشق و محبت کی شیفتگی و فریفتگی کے بکثرت دلائل موجود ہوں جس میں سوز و گداز کے نو بہ نو شواہد پائے جائیں، جس میں رقت و لطافت سختی و قساوت کے ادب و احترام کا کافی لحاظ رکھنا چاہیے اور کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جو معشوق کے شایانِ شان نہ ہو..... غزل گو شاعر کے لیے یہ عیب ہے کہ وہ فخر اور قدرت کا اظہار کرے۔" یہ رہے ابنِ قدامہ کے بنائے ہوئے قانونِ تغزل جن کے رو سے غالب قانون شکنی اور غزل کشی کے جرم میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ جس کی رو سے میر تو غزل گو کے لقب

سے مشرف کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تغزل ان کی خودی کا مرثیہ تھا اور غالب جس کا تغزل اس کی خودی کا قصیدہ تھا کیسے شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہ نظریہ ہے جس نے عربی اور عربی کے بعد فارسی تغزل کی بنیاد رکھی۔ اُردو تغزل بھی اسی بنیاد پر کھڑا ہوا اس لیے آغا جان عیش اور ان کے ہم زبان جن کا ذوقِ سخن اسی قسم کے نظریوں کا پروردہ تھا کیسے غالب کی غزل گوئی سے مطمئن ہو سکتے تھے وہ اگر کوشش کر کے "دامِ شنیدن" پھیلاتے بھی تو غالب کے "عنقائے فکر" کا شکار ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو ایک صدی پہلے کے لوگ تھے۔ اس موجودہ صدی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو غالب کو غزل گو تو غزل گو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست جو ذوقِ تغزل کے نبض شناس ہیں بہانگِ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ غالب شاعر نہیں تھا، فلسفی ہو تو ہو۔ لیکن آلِ احمد سرور اسے فلسفی سمجھنے پر بھی بخوشی آمادہ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ غالب کو پرکھنے کے لیے دنیائے علم و دانش میں ایک نیا خانہ بنایا جائے۔

غالب فلسفی و شاعر کے خانے میں کیا آئیں گے جب وہ مذہب کے بھی کسی خانے میں اٹتے ہوئے نظر نہیں آتے اور امتِ محمدیہ میں رہ کر بھی تمام ملتوں کو مٹا کر جزوِ ایمان بنانا چاہتے ہیں۔ جو مسئلہ وحدت الوجود میں صوفی، مسئلہ رویت باری تعالیٰ میں شیعۂ اثنا عشری، تقلید کے معاملے میں پکے وہابی اور حبِ علی ابنِ ابی طالب میں علی الٰہیت کی حدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ وہ ایک مفکر ہونے کی حیثیت سے نہ قنوطیوں کے گروہ میں کھڑے ہونے پر راضی ہیں نہ رجائین کی صف میں جو قیدِ حیات و بندِ غم دونوں کو ایک سمجھ کر بھی اس حقیقت کو قہقہوں کی گونج میں گم کر دینے کی دعوت دیتا ہو اسے کیا کہا جائے۔ یہ ایک سوال ہے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہم تو بس زیادہ سے زیادہ یہی بتلا سکتے ہیں کہ وہ ایک اجنبی روح اور ایک اجنبی ذہن تھا جو نہ معلوم کس سیارے سے بھٹک کر اس کرۂ ارض پر آ گیا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بحث اور قابلِ غور ہے کہ ہماری صدیوں کی انفعال پرستانہ غزل گوئی نے جو ایک انفعالی کیفیت ہمارے ذوقِ تغزل میں پیدا کر دی ہے۔ وہ غالب سے بھی وہی سوز و گداز مانگتی ہے جو اسے میر کے دیوان کے ہر صفحے پر ملتی رہی ہے اور غالب جب اسے بالکل مایوس کر دیتے ہیں تو وہ انھیں جھنجھلا کر درجۂ دوم کا شاعر کہہ دیتی ہے۔

بلاشبہ اگر تغزل نام ہے اسی انفعالیت کا جس کی تبلیغ ابن قدامہ کے تنقیدی شعور نے کی ہے تو بلا تکلف غالب کا نام متغزلین کی فہرست سے خارج کر دیجیے۔ کیونکہ سوز و گداز تو اسی شاعر کے کلام میں مل سکتا ہے جس کا ذہن جذباتِ عشق و آلامِ حیات سے مغلوب ہو، جو کسی جذبے کو اپنے اوپر مسلط ہونے نہ دے، جو ہر جذبے کی تحلیل کو اس کی نفسیاتی حقیقت کی تخفیف کر دے جو ہر غم کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کی جذباتی شدت کا مضحکہ اڑائے وہ ایسے اشعار کیسے کہہ سکتا ہے جنھیں سننے والا سن کر اپنی آنکھ سے آنسو بہائے۔ جو آنسو بہانے کو ایک ذہنی سبک سری سمجھے وہ خود کیسے رو سکتا ہے اور دوسروں کو کیسے رلوا سکتا ہے۔

غالب جو کسی کی موت پر بھی رونے کو بے حاصل سمجھتے تھے اور یہ کہہ کر رسم تعزیت کا مضحکہ اُڑاتے تھے "روئے وہ جسے خود نہ مرنا ہو۔" انھوں نے اپنی محبوب کی موت پر جو نوحہ لکھا ہے جسے غالب کے نادان دوست غالب کی حزنیہ شاعری کی ایک مثال ثابت کر کے غالب کی طرف سے بطور معذرت پیش کرتے ہیں ہمیں تو اس میں بھی المیہ سے زیادہ فکریہ آہنگ ملتا ہے:

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

غالب کے بعض عظیم نقادوں کا یہ خیال بھی کہ ان کا کوئی مخصوص نظامِ فکر نہیں تھا یہ ہمیں ایک جاہلانہ فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو غزل گو جو اپنی غزل کے ہر شعر میں ایک علاحدہ ذہن اور ایک علاحدہ تجربہ پیش کرتا ہے، اس کے متعلق یہ اندازہ لگانا کہ خود اس کا ذہن کیا تھا اور اس کے ذہنی رجحانات کیا تھے، ذرا مشکل کام ہے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے پورے مجموعۂ کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سلسلے میں ایک واضح نتیجے تک پہنچنا ناممکن نہیں ہے۔

داغ و میر تک کے میلاناتِ طبعی کا اندازہ ان کے کلام سے کیا جا سکتا ہے اور جس مضمون کو انھوں نے زیادہ باندھا ہے اسی کو سامنے رکھ کر ان کی ذہنیت کے مخصوص سانچے کا قیاس کیا جاتا ہے۔ غالب تو بہرحال ایک مفکر شاعر تھا اس کے دیوان سے اس کے نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی کو نچوڑ لینا بہرحال ممکن ہے۔ آپ اس کے دیوان کے چند اوراق ہی الٹ کر اس فیصلے تک پہنچ سکتے ہیں کہ اس کا معاشرتی رجحان اور اس کا سماجی میلان کیا تھا۔ وہ کس طرح کے معاشرے کا خواب دیکھ

رہا ہے اور بالکل آزادانہ طور پر دیکھ رہا تھا جو "دردِلِ سنگ بنگرم رقصِ بتاں آذری" کا مدعی ہو، جو پتھر کے دل سے خون کے قطرے ٹپکتے دیکھ سکتا ہو، جو تعمیر کے سینے میں تخریب کے عناصر کو گن سکتا ہو، وہ آنے والے زمانے کی آہٹ بھی سن سکتا ہے۔ اور اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اس نے مستقبل کے قدموں کی آہٹ سنی اور کارواں کے غبار کو دیکھ کر ایک نئے قافلۂ حیات کی آمد کا سراغ پالیا تھا:

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشوونما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

بات یہ ہے کہ فلسفی سوچتا ہے اور مدبّر اس کی سوچی ہوئی بات کو عملی پیکر دیتا ہے۔ قیصر ولیم اور ہٹلر نے نیٹشے کے فلسفے کی عملی توضیح کی۔ اقبال کے نظریۂ پاکستان کو جناح نے قالبِ حیات دیا۔ شبلی کے سیاسی میلانات کی روح ابوالکلام کی سیاسی وصحافتی زندگی میں ظاہر ہوئی اور غالب کی جدیدیت سرسید احمد کی عملی سرگرمیوں میں نمایاں ہوئی۔ اگرچہ سید موصوف غالب کے نئے ذہن کے پیغام کو دیر میں سمجھے تو اس کا اعتراف بھی کھل کر انھوں نے نہیں کیا کہ انھیں یہ روشنی کہاں سے ملی تاہم اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ غدر کے انقلابی دھماکوں نے جب ان کی آنکھیں کھولیں تو وہ غالب کے اس مشورے کو سمجھنے کے قابل ہو گئے جو غالب نے کچھ دنوں پہلے ایک فارسی نظم کی صورت میں آئینِ اکبری (مرتبہ سرسید) کے لیے بطور تقریظ یا تنقید لکھی تھی۔ لیکن جسے اس وقت سرسید کی تنگ نظری نے اپنے اڈیشن میں شامل کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ جس کی تشریح غالباً سرسید نے غدر کے بعد کی ملاقاتوں میں خود غالب کی زبان سے سنی ہوگی اور اپنے مردہ پرست ذہن میں زندہ دلی کا وہ جذبہ لے کر اُٹھے ہوں گے جو غالب کی وفات کے چند سال بعد ہی قوم کے لیے حیاتِ جدید کا ایک باضابطہ پروگرام بن کر علی گڑھ کالج کی صورت میں نمایاں ہوا۔ جس میں سب سے پہلے سرسید نے مسلم معاشرے کے فرسودہ ذہن کو نئے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھایا اور جیوں جیوں کالج کی دیواریں بلند ہوتی گئیں غالب کا پیغام ان کی بلندی سے فضا میں گونجتا اور پھیلتا رہا۔

؎ بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم

مرشد کا فرمان اپنے مرید کے نام

کہا جمیل سے غالب نے خواب میں اک رات
کہ تم ہو آج ہمارے معتبر آیات
تمہاری فکر سے ظرفِ غزل میں گنگ و فرات
مگر سخن سے زیادہ ہو کیوں سخن کی زکوٰت
تمہارا ذہن ہے کیوں وقف این و آن کیلئے

تمہاری مے سے سرِ محفل لنڈھا رہے ہیں لوگ
تمہاری آگ سے چولہے جلا رہے ہیں لوگ
تمہارے پھول سے گلشن سجا رہے ہیں لوگ
ہمائے عرش کو اُلّو بنا رہے ہیں لوگ
ہما کے پاس ہے کیا اس کے آشیاں کیلئے

گراں ہے تیل مگر خوں تمہار ستا ہے
کہ جس سے بزمِ سخن میں چراغ جلتا ہے
تمہارا خوانِ تکلم وہ خوانِ یغما ہے
کہ جس پہ مجمع اربابِ حرص ٹوٹا ہے
کچھ اس طرح کہ رہے کچھ نہ میزباں کیلئے

جو کور تھے انھیں بخشی ہے تم نے بینائی

خوشا معانی و الفاظ کی یہ دارائی
کہ طبعِ گنگ کو تقریر تم نے سکھلائی
جہانِ نطق کہے جن کو روحِ گویائی
زباں بنے وہ اشارات بے زباں کیلئے

مگر یہ عالمِ عیار تشنۂ ذرا ہے
ہر اک عزیز و وفادار تشنۂ خوں ہے
ہر اک مشفق و غم خوار تشنۂ خوں ہے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھو کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

غالب کا ایک طنز—— جنونِ خود آرائی پر

یوں بظاہر بے نیازی ہے مزاجِ یار میں
اک نیازِ التجا لیکن ہے ہر انداز میں
پھر بھی عالم میں غرورِ حسن کا آوازہ ہے

ذوقِ آرائش ہے کیا، ذوقِ نظر کا احترام
ورنہ پھر کیوں ہے خود آرائی میں اتنا اہتمام
روز و شب اس سلسلے میں اختراعِ تازہ ہے

ہے کبھی گیسوئے پیچاں میں گدِ عادت کا نکھار
اور کبھی زلفِ پریشاں میں وہ حسنِ انتشار
منتشر جس سے حواسِ عشق کا شیرازہ ہے

مدعا یہ ہے کرشمہ دامنِ دل کھینچ لے
مدعا یہ ہے کہ سرمہ دامنِ دل کھینچ لے
ہر مژہ چنگل ہے، چشمِ سرگیں شہ بازہ ہے

آئینہ حیراں ہے محوِ جلوہ کاریِ حسن ہے
شوق کی للچائی نظروں کا بھکاری حسن ہے
ہر خود آرائی شکستِ ناز کی غمازہ ہے

کم نہیں ہرگز جنونِ عشق سے سودائے حسن

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
"دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ ہے"
سلسلے زیور کے بیش و کم ہیں سامانِ قدیم
خوش لباسی کے بکھیڑے بھی ہیں خفقانِ قدیم
نیم عریانی کا جذبہ اک جنونِ تازہ ہے

غالب کے نقشِ قدم پر

رشک آئیدم بہ روشنی دیدہ ہائے خلق
دانستہ ام کہ از اثرِ گردِ راہ کیست

(غالب)

بیسویں صدی کے ادبی دور کو ہمیں عہدِ غالب کہنا ہی پڑے گا۔ اس لیے کہ اس دور میں غالب کے بدترین مخالف بھی غالب کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ یگانہ کی مثال ہمارے سامنے ہے جو بیانگِ دہل آتش کی تقلید کا دعوا کرتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر غالب کی پیروی کرتے رہے۔ ان کے ذوقِ سخن کا پیمانہ آتش کا بنایا سہی مگر اس پیمانے میں جو شراب ہے اس کی معنوی کیفیت خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم غالب ہی کے مے خانے کی جنسِ مستعار ہیں۔ لیکن ایک دور وہ بھی تھا جب کہ غالب کے قدرداں، غالب کے احباب اور غالب کے شاگردانِ خاص تک غالب کے مے خانۂ تلمذ کے حلقہ نشیں ہوتے ہوئے بھی مومن اور ذوق کا پیالہ پیے ہوتے تھے۔ آج جب کہ تلامذۂ غالب کا کلام ہمارے سامنے ہے، ہم آپ سے پوچھ سکتے ہیں کہ غالب کا وہ کون سا شاگرد ہے جسے آپ غالب کا صحیح معنوں میں مقلد کہہ سکتے ہیں۔ جس نے غالب کے نقشِ قدم پر قدم رکھ کر چند گام بھی چلنے کی کوشش کی ہو۔ شیفتہ اور سالک تو خیر مومن کی زندگی تک مومن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل رہے اور اپنی شاعری کی آخری عمر میں غالب سے منسلک ہوئے۔ اس لیے اگر ان کے کلام میں غالب کا رنگ و آہنگ نہیں پایا جاتا تو کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ حیرت تو ہے مجروح پر اور غالب کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہر گوپال تفتہ پر اور نورِ بصر لختِ جگر صفیر بلگرامی پر جنھوں نے اپنی

پوری شاعرانہ زندگی میں شاید چار شعر بھی ایسے نہ کہے جن میں غالب کا مخصوص ذوقِ سخن اور مخصوص آہنگ جھلکتا ہو۔ میرے مطالعے کی کم مائیگی نے غالب کے جتنے تلامذہ کے دیوان دیکھے ہیں غالب کے خاص رنگ کی کوئی چھینٹ کہیں ان میں نظر نہیں آئی۔ صرف ایک استثنیٰ نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں جن کی کم از کم ایک غزل جابجا غالب کے رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے:

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور سربسر غلط
بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں
اظہار پاکبازیٔ ذوقِ نظر غلط
سوزِ دروں سے ہونٹ پہ تب نالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ان کے دیوان میں کہیں کہیں غالب کی شوخیٔ طبع کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ جن کی بنا پر شاید انھیں یہ کہنے کا حق حاصل تھا کہ:

میں ہوں استاد کے حسنِ طبیعت کا شریک

اب رہے حالی تو وہ بقول خود غالب سے زیادہ شیفتہ سے مستفیض ہوئے۔ تاہم ان کے دیوان میں غالب کے رنگ کی جھلکیاں کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے تمام شاگرد غالب کی بھاری بھرکم شخصیت سے مرعوب ہو کر غیر ارادی طور پر ان کے شاگرد ہو گئے تھے ورنہ فی الحقیقت ان کا ذوقِ طبیعت غالب کے ذوقِ سخن سے متاثر نہ تھا۔ یا پھر غالب کے رنگِ تغزل کو وہ ایک ایسا بھاری پتھر سمجھتے تھے جس کو اٹھانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یا پھر ان کے ذہن کا سانچہ غالب کے ذہن سے مختلف تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ غالب کا کوئی شاگرد سوائے ناظم اور ایک حد تک حالی کے غالب کے نقشِ قدم کو چومتا ہوا نظر نہیں آتا۔

غالب کی موت کے بعد تقریباً تیس سال تک اُردو کی ادبی دنیا میں ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ بھی غالب کے اندازِ فکر کی طرف نہیں پھینکی گئی۔ لکھنؤ اور دلّی کے دبستان امیر اور داغ کے نغموں سے گونجتے رہے اور سونے والوں کے لیے لوری کا فرض انجام دیتے رہے۔ ایک ایسی فضا میں غالب کے صورِ انقلاب کی ناگوار چیخیں کس کو پسند آتیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس عہد کا شاعرانہ ماحول غالب کے نام سے واقف نہ ہو۔ وہ غالب کا نام بھی جانتا تھا اور کلام سے بھی روشناس تھا، لیکن اس سلسلے میں ان کی نگاہ غالب کے انھیں خذف ریزوں پر پڑتی تھی جن کے مضامین تمام تر تقلیدی ہوتے

تھے۔ غالب کی اجتہادی فکر نے اب تک انھیں چونکایا نہیں تھا۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر اس وقت بھی مقبول تھا:

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

لیکن ظاہر ہے کہ غالب کا یہ شعر اساتذۂ ایران کی ایک صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں ہے۔ اس میں نہ غالب کے مخصوص اندازِ فکر کا اجتہاد ہے نہ غالب کے ندرت پسندانہ ذہن کی کوئی ایسی جدت لیکن اس وقت کے تقلید پسند ذہنوں کو ان کا یہی شعر پسند تھا۔ ان کی نظر غالب کے رندانہ اشعار کے سلسلے میں غالب کے اس شعر کی طرف بھی نہیں گئی جس میں ان کا انقلاب پسندانہ رجحان کھل کر بول رہا تھا:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مئے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

بہرحال اگرچہ یہ دور دورِ غالب نہ تھا لیکن اس کے باوجود ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جسے ہم تلامذۂ غالب کا زمانہ کہہ سکتے ہیں، اُتر پردیش کے صوفی شاعر حضرت آسی غازی پوری اور بہار کے نامور فرزند مولانا فضلِ حق آزاد نے اپنی غزلوں میں غالب کی تقلید کا حق کماحقہٗ ادا کیا۔ اگرچہ اس مختصر سے مقالے میں دونوں کے مزاجِ شاعری کے تفصیلی جائزے کا موقع نہیں ہے تاہم ان کے کلامِ بلاغت نظام سے چند سرسری نمونے پیش کیے دیتا ہوں جن سے آپ ان بزرگوں کی غالب پرستی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام آسی

عین معنی ہے وہ دل عاشق معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دلدادۂ صورت بھی نہیں
غیر موسیٰ کون ہمدم وادیٔ ایمن میں تھا
غرق وہ بھی نشۂ صہبائے مرد افگن میں تھا

آسی دبستان ناسخ کے تربیت یافتہ تھے۔ ناسخیت اور غالبیت میں معنوی حیثیت سے صدیوں کا بُعد سہی لیکن تراکیب، بندش اور فارسیت کے غلبے کی وجہ سے دونوں کے لب و لہجے میں نمایاں

فرق نہیں اور جو فرق ہے اس کی لطافت کو ذوقِ سلیم ہی سمجھ سکتا ہے۔ آسی کے ذوقِ سلیم نے اس فرق کو محسوس کیا اور ناسخیت کو غالبیت میں منتقل کرنے کی ارادی کوشش کی جس کا ثبوت یہ اشعار ہیں:

محیط رنگ نیرنگ فنا میں
جمالِ دوست ہے ساحل ہمارا
متاعِ گرمیٔ بازار جاں ہے
وہ برقِ خرمن حاصل ہمارا

دبستانِ بہار میں شاد، درد کے پرستار تھے۔ نواب امداد امام اثر میر کا پیالہ پیے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کے تیسرے حریف فضل حق آزاد نے ان کے علی الرغم غالب کو اپنی فکرِ سخن کا رہنما بنا کر غالب کا رنگ اپنے تغزل میں اس طرح رچایا۔

نمونۂ کلامِ آزاد

یہ کس طرح کہوں کہ خدا سے دعا نہ مانگ
اے بے خبر خدا سے خدا کے سوا نہ مانگ
کانٹے کہتے ہیں، ہوا خواہِ چمن ہیں ہم بھی
گرچہ قسمت میں نہیں سنبل و ریحاں ہونا
ایک عالم میں ہیں دونوں سحر و شام یہاں
پا بہ زنجیر ہے خود گردشِ ایام یہاں
دانہ خرمن ہے تو ہے، ہستیٔ قطرۂ قلزم
اور ہی رنگ میں ہے عالمِ اجسام یہاں

ان نمونہ ہائے کلام کے ساتھ جب تلامذۂ غالب کی غزلیں آپ کے سامنے ہوں گی تو اس مقولے کی صداقت پر آپ کو ایمان لانا ہوگا کہ نزدیکاں بے بصر دور اور دوراں باخبر نزدیک۔ تلامذۂ غالب کا کیا شکوہ جب کہ سارا زمانہ ایک غزل (کے) راستے پر چل پڑا تھا۔ شاعری روح کی آواز نہیں الفاظ کا ایک طلسمی گورکھ دھندا بن کر رہ گئی تھی۔

غرض دلی سے لکھنؤ تک ذہن کی سطحیت اور فکر کی بدمذاقی کا ناسازگار فضا کا کم و بیش یہی حال

تھا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی لائی ہوئی نئی روشنی کی تیز چکا چوندھ میں ذہن کی آنکھیں کھلنے لگیں اور اسی کے ساتھ ایک طرف پنجاب سے اور دوسری طرف بنگال سے دو آوازیں ایسی بلند ہوئی جن کے لہجے میں غالب کے زورِ بیان کی جدت اور جن کی معنوی تہہ میں غالب کے انقلاب آفریں احساس کی شدت جلوہ گر تھی۔ اس نئی جلوہ گری کے اُجالے میں لکھنؤ کے نوجوان شعرا کو اپنے تغزل کی سطحیت کا احساس ہوا۔ غالب کا آسمان جب سامنے آیا تو انھیں اپنی زمین کی پستی واضح طور پر نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ لکھنؤ کی معیار پارٹی جس کا افتتاح بیسوی صدی کے مجتہدانہ رنگ سے متاثر ہو کر قائم کی گئی۔ ان انقلاب آفرینیوں میں شاد تو خیر نہیں لیکن وحشت اور اقبال غالب ہی کے اعلانیہ معتقد تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ کے اساتذہ صفی، عزیز، ثاقب، ناطق، چکبست اور رسوا نے معیار پارٹی کے عہد نامے پر نہیں غالب کی تقلید کے عہد نامے پر اپنے اپنے دستخط ثبت کیے۔ غالب کی پامال زمینوں میں مشاعروں پر مشاعرے ہونے لگے اور لکھنؤ کی دھان پان زبان غالب کے اسلوبِ بیان سے بھاری بھرکم ہونے لگی۔ صفی کہتے ہیں:

دستگیرِ کشتگانِ غمزہ دیکھا چاہیے
ہاتھ لاکھوں گوشۂ دامانِ قاتل ایک ہے

ایک مشاعرہ غالب کی مشہور زمین ع "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"، میں منعقد ہوا۔ جس میں لکھنؤ کے کم و بیش تمام شعرا نے اپنا زورِ طبع دکھلایا اور بقدرِ ظرفِ طبیعت غالب کی تقلید کا حق ادا کیا۔ عزیز لکھنوی کا مطلع ملاحظہ ہو:

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

رسوا کا مطلع غالب ہی کے سینے سے نکلی ہوئی ایک آواز معلوم ہوتا ہے:

وصف ذاتی ہے نہ ہندو نہ مسلماں ہونا
منحصر ذوقِ طبیعت پہ ہے انساں ہونا

اب چکبست کے اس مشہور شعر میں غالب پرستانہ آہنگ کی شدت ملاحظہ ہو:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

صفی کی پوری غزل اور یہ مقطع قابلِ غور ہے:

اہلِ دل چاہیے رفتار صفی کی تقلید
نہ بہت دوڑ کے چلنا نہ پشیماں ہونا

غرض سالہا سال تک مشاعروں کا یہ سلسلہ غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتا رہا اور بے چارے یاس عظیم آبادی کہ یہ اس وقت تک یگانہ نہیں بنے تھے جلتے توے پر لنتا رہا۔ لکھنؤ الہٰ آباد سے دور نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اکبر الہٰ آبادی اپنے ہم عصروں سے قریب ہوتے ہوئے ان کے تقلیدی رجحانات سے متاثر نہ ہوتے۔ آخر ان کو بھی کہیں نہ کہیں اپنے لب و لہجہ میں غالب کا انداز بیان اپنانا پڑا:

تو وضع پر اپنی قائم رہ فطرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
سینے میں دلِ آگاہ ہے گر کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی
بیتاب تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی

اساتذہ لکھنؤ کی غالب پرستی سے متاثر ہو کر کرنال کے ایک بزرگ حنیف علی رعب بھی اس طرف مائل ہونے لگے۔ ادب کا موجودہ ماحول رعب کے نام سے واقف نہ سہی لیکن تاریخ ادب کا حافظہ انھیں محو نہیں کرسکتا۔ یہ خانوادۂ تاریخ کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی نامختیت کو غالبیت کا قالب دے کر عمر بھر غالب کی تقلید کی۔ ان کے مجموعۂ کلام کے اوراق میں غالب کے رنگ کو ہر شخص پہچان سکتا ہے:

کچھ اس طرح سرِ محشر گناہ گار آیا
کہ شانِ عفو کو بے اختیار پیار آیا
نگاہِ شوق نے جس رعب کو نکالا تھا
پھر انجمن میں وہ رسوائے اعتبار آیا
نہ دیکھا غم زدوں نے کچھ سوا کنجِ نشیمن کے
رہے گلشن میں گلشن سے الگ رہ کر وہ گلشن کے
اُڑا اے قیس اپنی خاک اور محوِ تماشا ہو
تعجب کیا ہے دیوانے اسی پردے میں لیلیٰ ہو

نقاب آلودہ طلعت کیوں روش بیگانہ قامت کیا
تجلی وہ کہ ظاہر ہو قیامت وہ کہ برپا ہو

علی گڑھ کا ادارۂ علم و دانش اردو شاعری کی سطحیت اور سوقیت سے نالاں تھا۔ اس تربیت گاہ نے جو ارباب فکر و نظر پیدا کیے ان کی نگاہِ فکر و تجسس کو اگر غالب کے دیوان میں نئی شاعری کے امکانات نظر آئے تو تعجب نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں اس تربیت گاہِ فکر و فن کے پروردہ تھے۔ انھوں نے علاوہ سیاسیات کے اُردو شاعری کو بھی منہ لگایا جو کچھ کہا غالب ہی کے لب و لہجہ میں کہا۔ مولانا حسرت موہانی کے ذوقِ سخن پر مومن کے ذوقِ تغزل کی چھاپ ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن اس اشعار کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غالب کی تقلید سے بے نیاز رہے:

خرد کا نام جنوں پڑگیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی
سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

مولانا کے علاوہ اتر پردیش کے عظیم شعرا اصغر، فانی، جگر اور جوش کم و بیش غالب ہی کے آہنگ میں نوا پیرا رہے۔ ان کی نوا سنجیاں کہاں تک غالب کے آہنگِ خاص کی ممنون ہیں، یہ ایک مقالہ طلب بحث ہے جس کی یہاں گنجایش نہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت علی گڑھ کے دبستان کا شاہ کار جلیل تھی۔ یہ لیڈر کے ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے۔ عہدِ جدید کا ایک تذکرہ نگار انھیں مے خانۂ غالب کا حقیقی جرعہ نوش کہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کا ذوقِ سخن غالب کے ذوقِ سخن اور اندازِ فکر کا عکاس ہے۔ لیکن مے خانۂ غالب کے حقیقی جرعہ نوش بلکہ ساقیِ طریقت جوہر نہیں اقبال اور وحشت تھے۔

غالب کی فنی اور فکری میراث اصل دلی کا حق تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرا، سو یہ مثل اس سلسلے میں دلی پر صادق آتی ہے اور وہ سورج جو آگرہ سے اُبھر کر دلی کے اُفق پر چمکا وہ اپنے گرد و پیش ایک ستارہ بھی پیدا نہ کرسکا۔ اس کی تجلیوں کی فکری میراث پنجاب پہنچ کر اقبال کے ذہن کو ملی اور فنی ورثہ درمیان کے دو صوبوں کو چھلانگ کر بنگال کے وحشت تک پہنچا۔ دونوں کا سرمایۂ تغزل میرے دعوے کی کھلی دلیل ہے۔ اقبال غالب کے فلسفۂ حیات کی وضاحت کرتے

ہیں۔ غالب کے مسلکِ خود داری کے بطن سے اپنے نظریہ خودی کو جنم دیتے ہیں اور غالب ہی کی طرح انسانیت کے وکیل بن کر خدا سے جرح کرتے ہیں ع 'کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر'۔ وحشت ذہناً فلسفی نہ تھے، اس لیے انھوں نے غالب کی فنی میراث کو اپنایا اور غالب کی غزلیت کے تمام فنی بانکپن کو اپنی غزلوں میں اس طرح رچایا کہ غالب کے شاگرد جلیل حالی کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ آپ کا کلام غالب کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ وحشت کا دیوان جب ۱۹۱۰ء میں شائع ہو کر اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں پہنچا تو کلکتہ سے پشاور تک ادبی فضا چونک اٹھی۔ ان کے ہم عصر شعرا گھبرا گھبرا کے دیکھنے لگے کہ غالب کی روح کہاں سے بول رہی ہے۔ دیوان کا پہلا صفحہ اُلٹا تو انھیں یہ غزل ملی:

چلا تھا کوئے جاناں کو جنوں اور عشق رہبر تھا
فدائے رونقِ آشفتہ دستاری مرا سر تھا
ہمارے صبر سے پیدا تھا اک عنوانِ بے تابی
کبھی سر کی بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھا

دو شعر اور سنیے اور انصاف کیجیے کہ اگر اُس عہد میں ان شعروں کو غالب کا غیر مطبوعہ کلام کہہ کر پیش کیا جاتا تو اربابِ فکر و نظر میں کون یقین نہ کرتا کہ یہ سچ مچ غالب ہی کے منہ سے نکلے ہوئے بول ہیں:

مری مایوسیوں نے دی مجھے تعلیمِ گستاخی
کہ بیٹھا رہ گزر پر میں اُٹھایا جب مجھے در سے
یہ تیرا لطفِ بے ہنگام غیروں کو مبارک ہو
ہمیں معذور رکھ ہم ڈر گئے ہیں تیرے تیور سے

اور پھر یہ مطلع غالب کے رنگ میں کس طرح شرابور ہے:

دیر تک شورِ تبسم نمک افشاں نہ رہا
زخم کو دل سے ندامت ہے کہ پنہاں نہ رہا

مختصر یہ کہ اقبال اور وحشت دونوں کی ذات سے پنجاب اور بنگال میں غالب کے دو دبستانِ تقلید قائم ہوئے۔ پنجاب کے دوسرے شعرا نے اقبال ہی سے غالب کے نقشِ قدم پر پانو رکھ کر چلنا سیکھا۔ غلام بھیک نیرنگ ہوں یا حفیظ جالندھری، تاثیر ہوں یا فیض، تلوک چند محروم ہوں یا میلا رام وفا، جوش ملیسانی ہوں یا ان کے فرزند رشید عرش ملیسانی، ان میں سے کون غالب کا پیرو نہیں ہے۔ وحشت نے کلکتہ میں غالب پرستی کا ایک ایسا مے خانہ جاری کیا جس کا ہر رندِ مے نوش بجائے خود ساقی تھا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے، لیکن ان میں وحشت کی جانشینی کے حق دار آصف

بناری، شاکر کلکتوی مرحوم، قمر صدیقی اور خدا ان عمر دراز کرے، عباس علی خاں بیخود ہیں۔ ان میں سے ہر شخصیت اپنے تعارف کے لیے ایک مقالہ مانگ رہی ہے، لیکن اس صحبت میں اس کی کہاں گنجایش ہے۔ صرف ان کا ایک ایک شعر سن لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ کلکتہ نے غالب کی تمہید کا حق کس حد تک ادا کیا۔ حضرت آصف فرماتے ہیں:

تیری ادائے بے رخی کر نہ سکی قضا کا کام
تیری ادائے التفات آج یہ قرض ادا کرے

شاکر صاحب کا یہ شعر سنیے جو معرفت کا پیمانہ ہے:

تیرے لیے ہر ایک سے ملنا بھی ہے ضرور
تیرے لیے ہر اک سے کنارا بھی چاہیے

اب دیکھیے قمر صدیقی کے اس پیالے کو جس میں غالب کی مفلسانہ اور رندانہ زندگی جھلک رہی ہے:

بادہ خواری اور ناداری بہم آفت ہوئی
چشم پرنم ہوگئی خالی جو پیمانہ ہوا

آخر میں بیخود کا یہ شعر سنیے جس میں انھوں نے غالب کے دونوں ورثا اقبال اور وحشت کے ذوق کو کس سلیقہ سے سمویا ہے:

نہ پوچھو کیفیت اس حیرت آباد تمنا کی
خودی لے کر چراغ عقل برسوں مجھ کو ڈھونڈا کی

وحشت نے تقلیدِ غالب کی جو سبیل جاری کی تھی وہ ابھی بند نہیں ہوئی۔ ان کا ہر شاگرد اپنی جگہ مستقل مدرسۂ فکر و سخن تھا۔ آج بھی ڈھاکہ کی بزم آصفی اور کلکتہ کی بزم شاکری اپنی جگہ فیضانِ غالب کے وہ سرچشمے ہیں جن سے موجیں برابر اُٹھ رہی ہیں۔ اٹھ رہی ہیں دریا بن رہی ہیں اور آج بھی ان کی زبانِ حال سے غالب کی روح ڈنکے کی چوٹ نکتہ سرا ہے۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

آخر میں ایک نکتہ اور قابلِ غور ہے۔ غالب کی شاعری نے ادب کی شاہراہ پر اپنی اپنی کفِ پا سے جو چراغ جلائے ان کی روشنی میں اُردو نظم ہی نے اپنا بگڑا ہوا چہرہ نہیں سنوارا بلکہ بیسویں صدی میں اُردو نثر کا ارتقا بھی غالب کی شاعری کا بڑی حد تک ممنون ہے۔ یہ بحث ایک تھیسس کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اُردو نثر کے

جتنے عظیم فنکار ہوئے وہ تقریباً سب کے سب غالب کے خوانِ ادب کے نمک پروردہ اور ریزہ چیں تھے۔ سجاد حیدر یلدرم ہوں یا مولانا ابو الکلام آزاد، سلطان حیدر جوش ہوں یا مہدی افادی، سجاد انصاری ہوں یا مومن پرست نیاز فتحپوری، ان کے تصانیف کے اوراق اُلٹیے غالب کی ٹکسال کے سکے آپ کو ہر صفحے پر بکھرتے نظر آئیں گے۔ اور آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ فارسی کی ترشی ترشائی ترکیبوں سے اُردو نثر نے اپنا سنگار کیا اور کر رہی ہے۔ مستقبل کا نقاد اس کا محاسبہ کرے گا کہ اُردو نثر کی ارتقا میں غالب کا کتنا حصہ ہے۔ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، لیکن سچ پوچھیے تو اس کا قرض ابھی پوری طرح ادا نہیں ہوا۔ اس کی عظمت کے کتنے ہی گوشے ایسے ہیں جن پر نقاد کی نظر تک نہیں گئی۔ اس کے سربہ مہر کوزوں میں جو سمندر پنہاں ہیں ان کو باہر آنے کے لیے ایک اور صدی کے گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اگرچہ زمانہ آج بھی ہماری شاہراہِ ارتقا کے اس ذہنی سوز کو دیکھ رہا ہے اور پکار کر کہہ رہا ہے:

کہ گزر کرد ازیں راہ بہ شوخی وحشی
یعنی جادۂ پہلو و سینۂ صحرا گرم است

غالب

کل تخیل نے جو پرواز کے شہپر کھولے
اک افق زار تماشا نظر آیا مجھ کو

کہیں گمبھیر اندھیرے سے ملاقات ہوئی
کہیں بیتاب اجالا نظر آیا مجھ کو

طے کیا فکر نے اس طرح بلندی کا سفر
کہ جو اونچا تھا وہ نیچا نظر آیا مجھ کو

ذہن اس سطح پہ پہونچا کہ جہاں سے سورج
جھلملاتا ہوا تارا نظر آیا مجھ کو

جھک کے نیچے جو نظر کی تو بقول غالب
ایک بچوں کا گھروندا نظر آیا مجھ کو

دیر بتخانہ ہو یا دیر کلیسا و حرم
جس کو دیکھا سو وہ بچا نظر آیا مجھ کو

تیشہ و سیف و قلم، سبحہ و مینا و رباب
سب کے ہاتھوں میں کھلونا نظر آیا مجھ کو

الغرض ساتھ تھی غالب ہی کی بخشی ہوئی آنکھ
اس کا احساں جو تماشا نظر آیا مجھ کو

وہ نظر دی کہ چٹانوں کے کلیجے میں جمیل
رقصِ اصنامِ دل آرا نظر آیا مجھ کو

ذہنِ امروز کو تولا تو وہ پیغمبرِ فن
آج بھی شاعرِ فردا نظر آیا مجھ کو

کیوں نہ سجدے میں جھکے فکر کہ دیوان اس کا
مسجدِ دیدۂ بینا نظر آیا مجھ کو

جب بھی اس مصحفِ الہام کے اوراق اُلٹے
ایک پردا سا سرکتا نظر آیا مجھ کو

مظہری جب بھی کھلا اس کے معانی کا طلسم
تو مرا نطق بھی گونگا نظر آیا مجھ کو

غالب کے رد کردہ اشعار

اکبر رضا جمشید ایڈوکیٹ میرے عزیز خاص بھی ہیں اور مجھے ان کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ ہمارے صوبہ کے اُن نوخیز ادیبوں میں ہیں جو اُردو کی اُجڑی ہوئی مانگ میں افشاں چھڑکنے کی کوشش کررہے ہیں۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انہوں نے غالبؔ کے اُن جواہر پاروں کو جنہیں اُن کے زمانے کی ناسمجھی نے زیر خاک چھپا دیا تھا اُسے بروئے خاک لاکر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں عزیز موصوف نے خود کوئی اکتشافی جدوجہد نہیں کی لیکن اُن جواہر ریزوں کو جو مختلف رسالوں اور بیاضوں میں بکھرے ہوئے تھے انہیں اکٹھا کر کے ایک تھالی میں سجا دینا بجائے خود ایک ایسی وقیع خدمت ہے جسے نہ سراہنا ناانصافی ہوگی اور بدذوقی بھی۔ مجھے امید ہے کہ غالبؔ اکیڈمی اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُس مسبوت دیوان کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گی جس کے بطن سے یہ دیوان زادہ یعنی موجودہ دیوانِ غالب برآمد ہوا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' غالبؔ کے اُس دور کا کلام ہے جبکہ ان کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے بہت کچھ اردو میں کہا ہوگا جو ایک مجموعہ کی شکل میں انتخاب کرتے وقت اُن کے دوستوں کے سامنے ہوگا انتخاب کے بعد وہ مجموعہ کیا ہوگیا اور وہ بقیہ اشعار جسے نگاہِ انتخاب نے رد کردیا کس تجوری میں بند کردیے گئے؟ غالبؔ کے خاندان والے خصوصاً محترمہ حمیدہ سلطان اس سلسلہ میں کیا ہمارے ذوقِ تجسس کی تسکین کے لیے کوئی اکتشافی مہم ازسرِ نو جاری نہیں کرسکتیں؟ میرے خیال میں جمشید سلمہٗ کی اس کوشش نے غالبؔ پر ان کا بھولا ہوا قرض یاد دلایا ہے۔ عمر دراز باد۔

رُوحِ غالب سے

ہے بھی ہر ملک میں اے مظہری تقدیرِ فن
آنکھ کا پردہ اُٹھا سکتی نہیں تحریرِ فن

لفظ و معنی کا کہ نقش و رنگ کا فنکار ہو
شاعرِ جذبات ہو یا شاعرِ افکار ہو

بے نظر سے اپنے فن کی داد لے سکتا نہیں
حسن دے سکتا ہے شاعر آنکھ دے سکتا نہیں

شاعری ہے حسن کاری یعنی تخلیقِ جمال
بس یہیں تک منحصر ہے ہر سخنور کا کمال

اس میں مومن ہوں کہ آتش، مصحفی ہوں یا نظیر
دوسروں کا ذکر کیا بیشک خدائے فن تھے میر

ان کی ہر تخلیق لیکن حسن ہی دیتی رہی
اہلِ بینش سے خراجِ ہوش ہی لیتی رہی

اس نے کیا پایا شعورِ حسن کا طالب تھا وہ
الغرض ان حسن کاروں میں فقط غالب تھا وہ

اپنی کشتی ریگزارِ وقت میں کھیتا رہا
حسن دے کر اک شعورِ حسن بھی دیتا رہا

آج بھی اہلِ نظر سے اپنا حق لیتا ہے وہ
حسن بھی دیتا ہے وہ آنکھ بھی دیتا ہے وہ
جن حقائق پر تھا صدیوں سے روایت کا حجاب
آنکھ دے کر ان کے چہروں سے ہٹاتا ہے نقاب
جب تلک آنکھیں نہ ہوجائیں ضیا دیتا نہیں
یعنی وہ اندھوں کی آنکھوں میں دیا دیتا نہیں
پہلے چھوکر دیکھتا ہے نبض محسوسات کی
رفتہ رفتہ تربیت کرتا ہے پھر جذبات کی
ذوق گم ہونے نہیں پاتا طلسمِ نقل میں
رفتہ رفتہ صلح ہوجاتی ہے عشق و عقل میں
سوزِ دل حد سے جو بڑھ جائے گھٹا دیتا ہے وہ
ذہن کا اک معتدل سانچہ بنا دیتا ہے وہ
مرحبا اے خالقِ معنی خدائے فکر و فن
سدرۂ تخئیل تیرا منتہائے فکر و فن
تو نے خود بینی کو خود فہمی سکھائی بالفراغ
حسن سے آئینہ چھینا عشق کا بدلا دماغ
شوق کو تمکیں، خرد کو ذوقِ غمخواری دیا
جذبۂ نفرت کو احساسِ رواداری دیا
دیدۂ نرگس کو توفیقِ چمن بینی ملی
سنگ کو کچھ شیفتگی شیشے کو سنگینی ملی
شاعری تیری خودی و بےخودی کا امتزاج
ایک تعلیمِ تعقل، ایک تجدیدِ مزاج

حالی و اقبال ہوں یا جوہر و آزاد ہوں
دین کے معمار ہوں یا قوم کے فرہاد ہوں

ہیں سبھی اس جوئے شہد و شیر کے پالے ہوئے
ان کی ذہنیت کے سانچے ہیں ترے ڈھالے ہوئے

کیوں نہ ہو تیرا وطن کے عہد سازوں میں شمار
ہند کی تعمیرِ نو میں تیری اینٹیں بے شمار

تجھ سے پہلے منزلِ افسون و افسانہ تھا ذہن
چند فرسودہ عقائد کا صنم خانہ تھا ذہن

اس قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تری تائید سے
طائرِ تخئیل چھوٹا محبسِ تقلید سے

آج بھی دیوان تیرا اک صدائے دور ہے
فکرِ انسانی کی آزادی کا اک منشور ہے

بزمِ خیال

مرتب محمد رضا کاظمی، مصنف جمیل مظہری کا معنی شناس اور مزاج داں بنا اپنے والد مرحوم سید موسیٰ رضا کاظمی کے وسیلے سے۔ یوں جمیل مظہری اور ان کے برادر عزیز رضا مظہری اس حقیر کے نام خط کا آغاز ''ماموں کی جان، بچّو'' لکھ کر کرتے تھے، لیکن قلبی لگاؤ رشتہ داری سے سوا تھا۔ حضرت رضا مظہری، صدر مدرس مدرسۂ عالیہ، کلکتہ گھر پر مجھے اپنے بچوں کے ساتھ انگریزی و فارسی پڑھاتے تھے، بعد میں ان سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوگیا۔ بچپن میں علامہ جمیل مظہری سے قربت اور بعدازآں مراسلت کا ذریعہ یہی بزرگ اور نیک ہستیاں تھیں۔ اس کی ایک جھلک علامہ جمیل مظہری کے اس خط میں موجود ہے جو انھوں نے ۱۹۷۵ء میں مجھے عظیم آباد سے لکھا تھا:

''تمھارے ابا کو سلام شوق کے ساتھ آتش کا یہ شعر

نہ پوچھ حال میرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

تمنا تھی کہ مرنے سے پہلے ان سے ایک آخری ملاقات ہوجاتی، لیکن صورت حال کہہ رہی ہے کہ یہ تمنا حسرت ہی ہو کر رہ جائے گی۔ اگر یہی ہے تو پھر میری دعا ہے کہ انشاءاللہ وہی میری سنائی سنیں۔ خدا نہ کردہ کہ میں ان کی سنوں......

ہمیشہ دعا گزار

تمھارا مظہری

اس خط سے درج ذیل نظم ''آہ موسیٰ بھائی'' کے پس منظر پر نظر پڑتی ہے۔

۱

ہے صبر ایک جبرِ فطرت پھر بھی آنسو تھم نہیں سکتے
وہ کیا آنکھوں سے سنبھلے گا جو طوفاں دل سے آتا ہے
جس آسانی سے اٹھ جاتا ہے سر سے سایہ شفقت
یہ کیسا ظلم ہے صبر اتنی ہی مشکل سے آتا ہے

۲

اک ٹوٹتا طلسم ہے یہ دہر بے اساس
یہ عالم خیال ہے اک عالم قیاس
پیش نظر تھی ایک ستاروں کی انجمن
جھپکی جو آنکھ کچھ بھی نہ تھا آسماں کے پاس
باقی تھے ایک موسیٰ رضا وہ بھی چل دیے
اس مرگ ناگہاں نے کیے منتشر حواس
ہے پیچھے پیچھے ان کے جمیل سبک خرام
رفتار سست کردیں یہ ہے ان سے التماس
ہو دار عاقبت کا مبارک سفر انہیں
پہونچیں گے جلد ہم بھی وہیں ہے یہی تو آس
ملنے کی ہے امید تو کس طرح صبر آئے
کہتے ہیں جس کو صبر وہ ہے انتہائے یاس
اک چشمۂ خلوص تھے سو وہ بھی گم ہوا
اس دشت میں بجھائے گا کون اب دلوں کی پیاس
یہ موت اک خلوص و مروت کی موت ہے
مرنے کو یوں تو روز ہی مرتے ہیں سو پچاس
خوش ذوق و خوش مزاج و خوش اخلاق و خوش سیر
حق کوش و حق نیوش و حق آموز و حق شناس

جاتا ہو جس کا ذہن رسا باب خلد تک
آتی نہیں ہے ان کو فضا اس جہاں کی راس
تا باب خلد گرچہ تصور تھا اس کے ساتھ
آگے نہ بڑھ سکی نگۂ منزلت شناس
پوچھا سنہ وفات تو آئی ندائے غیب
دار علا میں موسیٰ رضا عسکری کے پاس

۱۹۷۶ء

حالاتِ مصنّف

نام۔ سید کاظم علی کاظمی ۔خاندان۔ والد مولوی خورشید حسنین (صاحبِ مثنوی جلوۂ حسن)، جد مولانا مظہر حسن (صاحبِ مثنوی نانِ خشک) شاگرد مرزا دبیر۔ پیدائش۔ ۱۹۰۴ء عظیم آباد، پٹنہ۔ شادی۔ ۱۹۳۵ء۔ تعلیم۔ ایم اے فارسی، کلکتہ یونی ورسٹی، ۱۹۳۱ء۔ تلمذ۔ خان بہادر رضا علی وحشت۔ مشاغل۔ (۱) مدیر روزنامہ ہند، کلکتہ، ۱۹۳۱ء۔ (۲) صحافی و کالم نگار روزنامہ عصرِ جدید، کلکتہ، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۳ء۔ (۳) انگلش ٹیچر مسلم ہائی اسکول، کلکتہ، ۱۹۴۳ء (عارضی)۔ (۴) سونگ پبلی سٹی آفیسر حکومت بہار، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء۔ (۵) فلمی صنعت سے وابستگی ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء۔ (۶) ڈپٹی ڈائریکٹر اطلاعات حکومت بہار، ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء۔ پروفیسر پٹنہ کالج، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء۔ پروفیسر پٹنہ یونی ورسٹی، ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۵ء۔ خصوصی پروفیسر، ۱۹۷۴ء۔ قید فرنگ۔ پھلواری جیل ۱۹۴۲ء۔ اعزازات۔ (۱) صدارت مجلس استقبالیہ کل ہند ادبی کانفرنس ۹ رجنوری ۱۹۳۶ء (۲) غالب مودی ایوارڈ برائے شاعری، ۱۹۷۴ء۔ تصانیف۔ ۱۔ شکست و فتح (طویل افسانہ)، کلکتہ، مکتبۂ ارتقا، ۱۹۵۰ء۔ ۲۔ نقشِ جمیل (نظمیں)، پٹنہ، مکتبۂ ادب، ۱۹۵۳ء۔ ۳۔ فکرِ جمیل (غزلیات، نغمات، رباعیات)، پٹنہ، مکتبۂ ادب، ۱۹۵۸ء۔ ۴۔ عرفانِ جمیل (مراثی و قصائد)، لاہور، بارگاہِ ادب، ۱۹۶۹ء۔ ۵۔ مثنوی آب و سراب، کلکتہ، مکتبۂ ارتقا، ۱۹۷۰ء۔ ۶۔ وجدانِ جمیل (مراثی و ملی نظمیں)، لاہور، بارگاہِ ادب، ۱۹۷۸ء۔ ۷۔ آثارِ جمیل (غزلیات و رباعیات)، پٹنہ، بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔ ۸۔ فریاد جوابِ فریاد (طویل نظمیں)، کراچی، ۱۹۸۹ء۔ ۹۔ منثوراتِ جمیل مظہری (افسانے اور تنقید)، دو جلدیں، پٹنہ، بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔ ۱۰۔ تحفۂ رونمائی (کتابچہ)،

پٹنہ ،غزالہ مظہری، حنا جعفری، ۱۹۹۲ء۔ ۱۱۔ عکسِ جمیل (نظمیں)، پٹنہ، بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء۔
کتابیات۔ ۱۔ سہیل جمیل مظہری نمبر (حصۂ اوّل) فکر و فن گیا، جولائی ۱۹۶۰ء۔ ۲۔ سہیل جمیل مظہری نمبر (حصۂ دوم) خدوخال گیا، اکتوبر ۱۹۶۰ء۔ ۳۔ مجلّہ جشنِ جمیل مظہری، پٹنہ، رائٹرز فورم، نومبر ۱۹۷۵ء۔ ۴۔ سہیل علامہ جمیل مظہری نمبر گیا، فروری ۱۹۸۲ء۔ ۵۔ ضمیمہ سہیل علامہ جمیل مظہری نمبر گیا، مئی ۱۹۸۲ء۔ ۶۔ کائنات علامہ جمیل مظہری نمبر، ہدایت گڑھ مرزا پور، جون ۱۹۸۲ء۔ ۷۔ آج کل جمیل مظہری نمبر، دہلی، اگست ۱۹۸۲ء۔ ۸۔ آگہی علامہ جمیل مظہری نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۹۲ء۔ ۹۔ حیاتِ دوام، اسماعیل حسنین نقوی، پٹنہ، عظیم آباد کتاب گھر، ۳۱/اگست ۱۹۸۰ء۔ ۱۰۔ نذرانۂ عقیدت، کلکتہ، ۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء۔ ۱۱۔ علامہ جمیل مظہری، قمر سلطانہ، نئی دہلی، زبانوں کا سنگم، مارچ، ۱۹۸۶ء۔ ۱۲۔ علامہ جمیل مظہری، حیات اور نثری تخلیقات کا مطالعہ، فضیل احمد، نئی دہلی ،موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دسمبر ۱۹۸۹ء۔ ۱۳۔ جمیل مظہری کی شعری تخلیقات: ایک مطالعہ، سید نعمت اللہ در بھنگا، لیتھو آرٹ پریس، ۱۹۹۰ء۔ ۱۴۔ جمیل مظہری، مظہر امام، نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء۔ ۱۵۔ جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ، فضیل احمد، نئی دہلی، سیمانت پرکاشن، ۱۹۹۵ء۔ ۱۶۔ جمیل مظہری بحیثیت نثر نگار، سید نعمت اللہ، نئی دہلی، تخلیق کار، ۱۹۹۷ء۔ ۱۷۔ جمیل مظہری کچھ یادیں کچھ باتیں، ثریا جمال مظہری، پٹنہ، غزالہ مظہری، حنا جعفری، ۲۰۰۲ء۔ ۱۸۔ جمیل مظہری اور پریم گپتا، ثریا جمال مظہری، پٹنہ، غزالہ مظہری، حنا جعفری، ۲۰۰۳ء۔ ۱۹۔ ذکرِ جمیل، پٹنہ، خدا بخش لائبریری، ۲۰۰۶ء۔ ۲۰۔ مظہر جمیل، نئی دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء
وفات۔ ۲۳/جولائی/۱۹۸۰ء، بھیکن پور بہار۔

حالاتِ مرتب

نام۔ محمد رضا کاظمی ۔ خاندان ۔سادات موسوی، والد موسیٰ رضا کاظمی، ٹیکسٹائل کمشنر، حکومت ہند پیدائش ممبئی کیم نومبر ۱۹۳۵ء۔ تعلیم ایم اے (اسلامی تاریخ) ۱۹۶۸ء، پی ایچ ڈی (مطالعۂ پاکستان) ۱۹۹۶ء، جامعہ کراچی تلمذ رضا مظہری، سردار نقوی۔ مشاغل: تدریس سرکار سندھ کے کالجوں میں ۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۰ء جامعات کراچی، آغا خان، محمد علی جناح اور اقرا یونیورسٹی ۱۹۹۹ء تا ۲۰۱۲ء۔ ادارتی مشیر، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۳ء۔ تصانیف اردو۔ جدید اردو مرثیہ کراچی، مکتبۂ ادب ۱۹۸۱ء ۔ تاب سخن، کراچی، مکتبہ ادب، ۱۹۹۳ء، نقوش جوش، کراچی، حیات اکیڈمی، ۱۹۹۵ء ۔تہذیب وتحقیق، مرکز مطالعہ ، پاکستان، جامعہ کراچی، ۲۰۰۸ء۔ معرضِ اظہار کراچی الفاظ فاؤنڈیشن ۲۰۱۳ء۔ تالیف: اردو ورثہ، انتخاب کلام میر تقی میر، مرزا سودا، نظیر اکبرآبادی، مصحفی، غالب، ذوق، مومن، میر انیس، شاد، مبارک عظیم آبادی، یاس یگانہ، علامہ اقبال، جوش، جمیل مظہری، اختر شیرانی، مجاز اور ساحر لدھیانوی۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۲ء۔ ترجمہ: عبدالقیوم ناطق، صراط مستقیم، کراچی، طاہر سنز ۱۹۸۷ء۔ انگریزی Liaquat Ali Khan His Life and Works اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۳ء، A Concise History of Pakistan اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۹ء۔ The Blood of Husayn کراچی، لٹرا ماء ۲۰۱۱ء۔ دونوں زبانوں میں مقالات، مضامین اور تبصرے ان کے علاوہ ہیں۔

[redacted]

فیضان غالب

جمیل مظہری

اردو تنقید پروان چڑھی ہے مرزا غالب پر مشق ناز کرتے ہوئے۔ حالی کی یادگار غالب سے لے کر شمس الرحمن فاروقی کی تفہیم غالب تک جتنے سنگ میل ہیں انھوں نے ہماری چشم تنگ کو وا کیا ہے۔ اردو تنقید کے اس قیمتی سرمائے میں سے بیشتر کا احاطہ ظ انصاری نے غالب شناسی کی دو جلدوں میں کرلیا ہے۔ تاہم غالب سے معاملہ سخن فہموں کے علاوہ سخن وروں کا بھی رہا ہے جو تخلیقی سطح پر غالب کو برتتے آئے ہیں۔ علامہ جمیل مظہری بیسویں صدی کے ان مفکر شاعروں میں ہیں، جنھیں ان کے معاصرین دبستان غالب سے منسوب کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں اسلامی ہند کی ذہنی بیداری میں غالب کی عطا کا تعین کیا گیا ہے، غالب کے سماجی رویوں کی جدت کا تجزیہ بھی ہے، نیز تنقید غالب کی اسلوبی پیمائش بھی۔ مختلف نظموں میں غالب کے فکر و فن کے گوشے منور کیے گئے ہیں۔ گویا یہ کتاب فکری جواز بھی رکھتی ہے اور فنی جواز بھی۔ امید ہے کہ اردو شاعری کے شیدائی اس پیش کش کو دو آتشہ پائیں گے۔

مصنف کے بارے میں: جمیل مظہری نہایت اچھے شاعر اور نہایت گہرے مفکر بھی ہیں اور کردار میں اتنی استقامت ہے کہ پہاڑ جگہ چھوڑ دے سکتے ہیں مگر وہ اپنے موقف سے جنبش نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے ذہین آدمیوں کی ذہانت ان کی ذہانت کے مقابلے میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے چاقو کی باڑھ جلیبی بلیڈ کی دھار کے سامنے ——جب تک انھیں جسمانی زد و کوب کا اندیشہ ہو شعر نہیں سناتے——

جوش ملیح آبادی

جمیل مظہری اس طبقۂ مخصوص کے انشا پرداز ہیں جن کو جاننے والے جانتے ہوں تو جانیں اور اگر کوئی نہ جانے تو انھیں اس کی فکر ہوتی ہے نہ کاوش۔ وہ نہایت خوش گو شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں اور خیال کی رعنائی اور اسلوب بیان کی گیرائی ان کے افکار نثر و نظم کی خصوصیت خاصہ ہیں——

نیاز فتح پوری

مرتب کے بارے میں: تم نے جس فراخ دلی کے ساتھ مجھ پر اعتراض کیے ہیں میں بھی اسی فراخ حوصلگی کے ساتھ تمہاری اس آزادروی کی داد دیتا ہوں——

جمیل مظہری